بیلنس شیٹ

کاروباری اداروں میں نفع نقصان کا حساب رکھنے کے لیے کمپنی کی بیلنس شیٹ بنائی جاتی ہے۔ یہ بیلنس شیٹ بتاتی ہے کہ ادارے کے پاس کیا کچھ ہے، کیا لینا ہے اور اسے دوسروں کو کیا ادا کرنا ہے۔ یہ بیلنس شیٹ متعدد مراحل سے گزر کر تیار ہوتی ہے جس میں کئی مرحلوں پر حساب کتاب رکھ کر تیار کیا جاتا ہے اور اسے دیکھ کر ایک لمحے میں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ادارہ مالی طور پر نفع میں ہے یا نقصان میں جا رہا ہے۔

ہر ادارہ یہ اہتمام کرتا ہے کہ بیلنس شیٹ صحیح بنے۔ کسی کمپنی میں یہ ممکن نہیں کہ حقیقت کچھ اور ہو اور اعداد شمار غلط ڈال کر بیلنس شیٹ تیار کی جائے۔ اثاثے لاکھ کے ہوں اور بیلنس شیٹ میں کوئی خوش فہم کروڑ لکھ دے۔ ادائیگیاں دس کروڑ کی کرنی ہوں اور غلط فہمی سے دس لاکھ کی لکھ دی جائیں۔ یہ اگر کسی نے کیا تو اسے بدترین نقصان اٹھانا پڑے گا۔

بدقسمتی سے ہم میں سے بیشتر لوگ اپنے نامہ اعمال کی بیلنس شیٹ ایسی ہی غلط بیانیوں اور خوش فہمیوں کی بنیاد پر بناتے ہیں۔ ہم ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتے بلکہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو معیار بنانے کے بجائے اپنے تعصّبات کے تحت غلط فہمیوں اور اپنی خواہشات کے تحت خوش فہمیوں کا شکار ہو کر کرتے ہیں۔ ہم ایمان، عدل، احسان اور انفاق کو بھول جاتے ہیں اور اپنے خودساختہ معیارات پر ہر لمحہ اپنی بیلنس شیٹ میں ستر ہزار نیکیوں کا ثواب لکھتے رہتے ہیں۔ ہم ظلم، ناانصافی، حق تلفی اور الزام و بہتان کو چھوٹی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ ان کی موجودگی ہمارے ہر عمل کو صفر کر کے ہمیں ابدی خسارہ سے دوچار کر دے گی۔

اپنے تعصّبات اور خواہشات کو دین سمجھ کر بیلنس شیٹ میں ڈالنے سے نجات ممکن نہیں۔ اس کے لیے ہمارے ہر عمل کو قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھنا اور سیرت طیبہ کے معیار پر تولنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہم خود کو جو بھی سمجھیں، قیامت کے دن ہماری بیلنس شیٹ صرف خسارہ دکھائے گی۔

معذوری

ہم میں سے ہر شخص زندگی میں جب کبھی سخت بیمار ہوتا ہے تو وہ ایک نوعیت کی عارضی اور جزوی معذوری کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ اس مرحلے میں ہم یہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ مستقل اور مکمل معذوری کے ساتھ زندگی گزارنا کس قدر مشکل کام ہے۔ معذور کی مصیبت کو سمجھنے کا ایک اور ذریعہ کسی معذور شخص کو قریب سے دیکھنا اور اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا ہے۔ اس کے بعد ہی ہمیں اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس دنیا میں معذوری سے بڑی مصیبت کم ہی ہوتی ہے۔

دنیا میں کوئی بھی معذور نہیں ہونا چاہتا۔ مگر پھر بھی لوگ معذور ہوجاتے ہیں۔ معذوری سے متعلق ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں جزوی طور پر معذور ہوجانے والوں کی شرح پندرہ فیصد جبکہ مکمل طور پر معذور لوگوں کی شرح دو تا چار فیصد ہے۔ یہ معذور لوگ سخت ترین حالات میں زندگی گزار کر رخصت ہوجاتے ہیں۔ تاہم کل قیامت کے دن جب یہ معذور لوگ اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو ان کی معذوری قیامت کے دن ان کے لیے ایک عذر بن جائے گی۔ مالک دوجہاں ان کے ساتھ بہت نرمی اور درگزر کا معاملہ کرکے ان کے حق میں اپنی رحمت کا فیصلہ کرکے اپنے فضل سے نوازیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک ذریعہ بنا کر صحت مند لوگوں کو یہ پیغام دیا تھا کہ وہ کس درجے کی عافیت اور آسانی میں زندہ ہیں۔

دوسری طرف ہمارے جیسے صحت منداور صحیح وسالم لوگ جب اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو ان کے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی کتنی شکرگزاری کی۔ اس کی کتنی بندگی کی۔ اپنے اعضاء کو اس کی نافرمانی سے کتنا روکا۔ ہاتھ پاؤں، گویائی اور بصارت، صحت اور عافیت کو بندوں کی مدد میں کتنا لگایا۔ نصرت دین کا کیا کام کیا۔ اس روز بہت سے صحت مند یہ خواہش کریں گے کہ کاش وہ معذور پیدا ہوتے۔ کاش وہ معذور ہی مر جاتے۔

سوائے ان کے

قرآن مجید کا آغاز سورہ فاتحہ سے ہوتا ہے۔ یہ سورہ دراصل ایک دعا ہے۔ اس کا خلاصہ اگر کیا جائے تو یہ ہے کہ مانگنے والا یہ جانتا ہے کہ اس کا اور سارے جہانوں کا پالنے والا ایک انتہائی مہربان رب ہے۔ دینے والے نے مانگنے والے کے دست طلب کے جواب میں مادی نعمت کا ہر در کھول رکھا ہے۔ مگر مانگنے والا یہ جانتا ہے کہ بہت جلد ایک بدلے کا دن آ رہا ہے جب دنیا کی تمام مادی نعمتیں بے کار ہو جائیں گی۔ اس دن صرف ہدایت کی روحانی نعمت ہو گی جسے دے کر نئی دنیا میں جنت کا مادی نفع ملے گا اور جہنم کا ضرر دور ہو گا۔

یہی ہدایت کی دعا سورہ فاتحہ کا مرکزی خیال ہے اور پورا قرآن اسی دعا کا جواب ہے۔ یہ ہدایت کلام الٰہی میں جا بجا بکھری ہوئی ہے۔ یہ ہدایت اللہ کو سب سے بڑھ کر محبوب بنا لینے کا نام ہے۔ یہ رب کی بندگی اور اس کی اطاعت کا راستہ ہے۔ یہ والدین، اقربا اور ضرورت مندوں پر احسان اور انفاق کا نام ہے۔ یہ اپنوں ہی سے نہیں دشمنوں سے بھی عدل کرنے کا نام ہے۔ یہ شرک، فواحش، منکرات، معصیت، بدعت اور خبائث سے بچ کر زندگی گزارنے کا نام ہے۔ یہ ہدایت امانت و دیانت، عہد و میثاق کی پاسداری، صدق و سچائی پر قائم رہنے کا نام ہے۔ یہ غیبت، الزام، بہتان، جھوٹ، منافقت، ریا کاری سے دامن چھڑانے کا نام ہے۔

اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنی پاک کتاب میں اس ہدایت کی پوری تفصیل بیان کی اور پھر اس تفصیل کا خلاصہ اپنے محبوب کی بے مثل سیرت میں ہمارے لیے محفوظ کر دیا۔ صاحب خلق عظیم کا اسوہ حسنہ اسی ہدایت کا چلتا پھرتا نمونہ تھا جس کی تفصیل آج بھی ہم جانتے ہیں۔

ہدایت کے اس اہتمام کے بعد کوئی انسان گمراہ نہیں ہو سکتا۔ سوائے ان کے جو اپنے تعصّبات کی وجہ سے خدا کے غضب کا شکار ہو جائیں۔ سوائے ان کے جو اپنی خواہشات کا شکار ہو کر گمراہی کی پگڈنڈی پر چل پڑیں۔

دنیا و آخرت کی بھلائی

اس دنیا میں انسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے منصوبے سے متعلق دو باتیں ایسی ہیں جن میں قرآن مجید آخری درجے میں واضح ہے۔ لیکن لوگ ان دو باتوں کو ماننا نہیں چاہتے۔ اسی چیز نے اسلام کے دعوے دار ہر شخص کو ذہنی سکون سے محروم کر رکھا ہے۔

پہلی بات جسے نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ بے سکونی کا شکار ہیں وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ نے انسان کو آزادی دے کر بھیجا ہے اور اس امتحان میں ڈالا ہے کہ اسے کسی بیرونی دباؤ کے بغیر خود اپنی مرضی سے اس آزادی سے دستبردار ہو کر خدا کی بات ماننی ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ چاہتے تو انسانوں کو یہ آزادی ہی نہ دیتے بلکہ دیگر مخلوقات کی طرح وہ بھی اختیار و آزادی سے محروم ہو کر اطاعت کرتے رہتے۔

بدقسمتی سے بہت سے لوگ اس حقیقت کو نہیں ماننا چاہتے۔ وہ دعوت، تلقین، ترغیب و ترہیب اور تربیت کے بجائے نافذ کر کے، ٹھونس کر اور اب تو دھونس و دھمکی کے ساتھ اپنا فہم دین لوگوں سے منوانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ممکن نہیں۔ چنانچہ یہ کرنے والے ہمیشہ سکون و اطمینان سے محروم اور مسلسل اضطراب کا شکار رہتے ہیں۔

دوسری حقیقت اس امتحان سے متعلق یہ ہے کہ اس امتحان میں انسان کا نصب العین دنیا کو جنت بنانا نہیں، بلکہ ہر طرح کے حالات میں ایمان و اخلاق کے تقاضوں پر قائم رہ کر خود کو جنت کا حقدار ثابت کرنا ہے۔ یہ دنیا کبھی جنت نہیں بن سکتی۔ ہاں بہتر ہو سکتی ہے اور اسے بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ مگر یہ اصل مسئلہ نہیں۔ اصل مسئلہ یہاں رہ کر ایمان و اخلاق کا بہترین نمونہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہستی بننے کی کوشش کرنا ہے۔

جس شخص نے ان دو باتوں کو سمجھ لیا وہ دنیا و آخرت کی ہر خیر پا گیا۔ جس نے انھیں نہ سمجھا وہ دنیا و آخرت دونوں میں محروم اور بے سکون رہے گا۔

اگر منافق کو بھی......

جنگ تبوک اسلامی تاریخ کی اہم ترین جنگوں میں سے ایک ہے۔اس جنگ میں ہر مسلمان کی شرکت لازمی تھی۔مگر منافقین اس موقع پر مختلف عذر بنا کر راہ فرار اختیار کر گئے۔ چنانچہ سورہ توبہ نازل ہوئی اور اس میں منافقین پر اس طرح شدید گرفت کی گئی کہ جس کی کوئی حد نہیں۔اس سے قبل سورہ نساء،سورہ مائدہ،سورہ منافقون وغیرہ میں بھی منافقین پر بہت سخت تنقید کی گئی ہے۔ اور انھیں جہنم میں کفار سے بھی سخت سزا کا حقدار قرار دیا گیا ہے،(نساء145:4)۔

مگر قران پاک اور سیرت کا ایک طالب علم یہ جان کر حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ اس سخت ترین تنبیہات کے باجود کبھی کسی منافق کو اس کے نفاق کی بنا پر کوئی شرعی سزا نہیں دی گئی۔حتیٰ کہ سردار المنافقین عبداللہ ابن ابی جیسا شخص جس کا نفاق ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر تھا اور جو کفار اور یہود کا ساتھ دینے ،مسلمانوں کو باہم لڑانے اور سیدہ عائشہ پر تہمت لگانے جیسے بدترین جرائم میں ملوث تھا،طبعی موت مر کر اس دنیا سے رخصت ہوا۔

اس ناقابل یقین حقیقت کا سبب یہ تھا کہ منافقین ظاہری طور پر ہمیشہ خود کو مسلمان کہتے رہے۔اور جب تک کوئی شخص خود کو مسلمان کہتا ہے اس کی جان کسی صورت میں اور کسی قیمت پر نہیں لی جاسکتی۔اگر اس کا کوئی ادنیٰ سا بھی جواز ہوتا تو دور رسالت میں مدینہ میں ایک منافق کو بھی زندہ چھوڑنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ہمارے تمام فقہا نے بھی سوائے قاتل،شادی شدہ زانی اور اسلام چھوڑنے کا اعلان کرنے والے کے سوا کسی مسلمان کے قتل کی اجازت نہیں دی۔

اس تاریخی اور ناقابل تردید حقیقت کے باوجود اگر آج ہمارے معاشرے میں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں کی جانوں کی حرمت پامال کی جارہی ہے تو اس کا ماخذ کچھ بھی ہوسکتا ہے، اللہ اور اس کے رسول کی طرف اس کی نسبت نہیں کی جاسکتی۔ باخدا اللہ اور اس کا رسول ہر ایسی زیادتی سے بری ہیں اور خدا کا خوف رکھنے والا ہر مسلمان بھی اس جرم سے بری ہے۔

ایکس، وائی، زی تھیوری

ہمارے ہاں بیشتر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں کہ دور جدید میں جتنا ارتقا سائنسی علوم میں ہوا ہے اتنا ہی یا شاید اس سے زیادہ ارتقا سماجی علوم میں ہوا ہے۔ سماجی علوم میں سے نفسیات اور سوشیالوجی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان پر کی گئی تحقیق سے سماجی ماہرین نے انسانوں کی کارکردگی کے حوالے سے تین نظریات پیش کیے ہیں جن کا استعمال عام طور پر مینجمنٹ سائنس میں کیا جاتا ہے۔ یہ ایکس، وائی اور زی تھیوری کہلاتی ہیں۔

ایکس تھیوری کے مطابق عام انسان کام سے بچنا چاہتے ہیں اور بغیر جبر اور دباؤ کے کام نہیں کرتے۔ وائی تھیوری اس کے برعکس نقطہ نظر پیش کرتی ہے یعنی لوگ دباؤ اور خوف کے بجائے اپنی اس فطری جبلت کے مطابق کام کرنا چاہتے ہیں جس کے نزدیک کام، کھیل اور آرام جتنا ہی اہم ہے اور عام حالات میں لوگ معاوضہ ملنے کی امید پر خود ہی ذمہ داری سے کام کر لیتے ہیں۔ زی تھیوری کے مطابق کسی شخص کے کام کرنے کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ جس کے لیے کام کیا جا رہا ہے وہ اس کی ضروریات کا کس حد تک خیال کرتا ہے۔

یہ تینوں تھیوریز اپنی اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہیں۔ دور جدید کے کارپوریٹ کلچر میں مینجمنٹ انھی کی بنیاد پر لوگوں سے معاملہ کرتی ہے۔ تاہم قرآن مجید کے ایک طالب علم کے لیے یہ قرآن مجید کی حقانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید نے آج سے ڈیڑھ ہزار برس قبل، جب کسی نے باقاعدہ علم نفسیات پر کام کیا تھا نہ سماجیات پر، بندوں اور رب کے تعلق کو جب موضوع بنایا تھا، ٹھیک انھی تین پہلوؤں سے انسانوں کو رب کی بندگی پر ابھارا۔

پہلا پہلو وہی ہے جسے ایکس تھیوری بیان کرتی ہے یعنی بعض اوقات اور کچھ لوگوں کے لیے

دباؤ ڈال کر جھنجھوڑنا ہی ان سے کام کرانے کا درست طریقہ ہوتا ہے۔ اس کو قرآن مجید انذار کہتا ہے۔ یعنی اللہ کی پکڑ اور جہنم کی سزا اور اس کے عذابوں کی شدت کا تصور دلا کر لوگوں کو نافرمانی سے روکا جائے۔ دوسرا پہلو وائی تھیوری والا ہے۔ یعنی بندگی انسانوں کی فطرت میں شامل ہے اور جب ساتھ میں اللہ کی رضا اور جنت کی خوشخبری کے پہلو سے لوگوں کو ابھارا جاتا ہے تو لوگ اپنی فطرت کے زور پر اور جنت کے شوق میں اللہ کی عبادت اور بندگی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

تیسرا پہلو زی تھیوری والا ہے۔ اس پہلو میں قرآن مجید لوگوں کو آسمان سے لے کر زمین تک اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، رحمت، شفقت اور عنایات کے ان انتظامات کی طرف توجہ دلاتا ہے جو انسان کی ہر ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ قرآن مجید بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی دی۔ عدم سے وجود بخشا۔ اس کے لیے آسمان سے پانی اتارا۔ دن کو سورج سے روشن کیا اور دامن شب کو چاندی کا چراغاں دیا۔ میاں بیوی کا محبت والا تعلق پیدا کیا۔ پھر اس سے ان کی نسل چلائی۔ ہزاروں قسم کے جانداروں کے لیے صرف گھاس اور چارے کو پیدا کیا لیکن انسان کے لیے طرح طرح کے ذائقے پیدا کیے۔

ان جیسی ہزاروں نعمتوں کو یاد دلا کر قرآن مجید لوگوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جس رب نے ان کے لیے یہ سارے اہتمام کیے ہیں، وہی اس قابل ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ جس نے انسانوں کی ہر ضرورت کو پورا کیا اور مستقبل میں بھی پورا کرنے کی یقین دہانی کرا رہا ہے اسی کی عبادت کا راستہ درست راستہ ہے۔

انسان بندگی کی اس دعوت کو مانیں نہ مانیں یہ ان کا مسئلہ ہے لیکن قرآن کا یہ طریقہ دعوت اب سماجی علم کی ترقی سے بھی سند تصدیق حاصل کر چکا ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن مجید اسی رب کا نازل کردہ ہے جو ہر انسان کا خالق اور سب سے بڑھ کر ان کی نفسیات کو جاننے والا ہے۔

جدید روحانیت اور اجنبی اسلام

روحانیت کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی مذہب کی تاریخ ہے۔ روحانیت کی کوئی حتمی اور متعین تعریف کرنا تو بہت مشکل ہے مگر عام طور پر اس سے مراد مقدس ہستیوں یا تصورات سے وابستگی، عقل اور حواس سے ماورئی روحانی تجربات و مشاہدات، مراقبہ، ترک دنیا، زہد و ریاضت اور ضبط نفس پر مبنی زندگی رہی ہے۔

زمانہ قدیم میں روحانیت مذہب اور تصوف کے ملاپ سے وجود میں آتی تھی۔ یہودیت، مسیحیت اور اسلام جیسے آسمانی مذاہب کے علاوہ ہندومت، بدھ مت اور جین مت جیسے مذاہب میں اس ملاپ سے پیدا ہونی والی روحانیت کی اساسات بہت مضبوط رہی ہیں۔ ان مذاہب کے روحانی لوگوں کی مشترکہ اقدار وہی ہوتی تھیں جو اوپر بیان ہوئی ہیں، البتہ اپنے اپنے مذاہب کے زیر اثر مقدس شخصیات، زہد و عبادت کے طریقے اور روحانی تجربات کی نوعیت میں کچھ تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ مگر ہر ایک کا مقصود مذہب کے قانونی پہلوؤں اور ظاہری مراسم سے بلند ہو کر اپنی ذات میں ڈوب کر دل کا سکون تلاش کرنا ہوتا تھا۔

تاہم دور جدید میں جب مذہب اور عقیدے کو انسان کی زندگی میں مرکزی مقام حاصل نہیں رہا ہے، روحانیت کی ایک نئی قسم عام ہو چکی ہے جسے غیر مذہبی روحانیت یا Non Religious Spritiuality کہا جاتا ہے۔ ایک پہلو سے یہ دور جدید کے انسان کا نیا مذہب ہے جو مذہبی عقیدے، ظاہری شناخت، مراسم عبودیت سے ہٹ کر انسانیت کی اعلیٰ اقدار جیسے محبت، ہمدردی، رحم، درگزر اور باطنی اور ظاہری پہلوؤں سے انسان کو سکون اور آرام پہنچانے کا نام ہے۔ یہ رنگ و نسل سے بلند ہو کر کائناتی اور آفاقی انسانوں کی تشکیل پر مبنی مذہب ہے۔

مذہب سے بالاتر اس روحانیت کی مقبولیت میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔

اس کی بنیادی وجہ اہل مذہب کا باہمی تفرقہ اور ایک دوسرے سے نفرت، اختلاف رائے پر عدم برداشت، متشددانہ اور انتہا پسندانہ سوچ، اپنے خیالات دوسروں پر ٹھونسنے اور بالجبر نافذ کرنے کا رویہ اور دہشت گردی کی حمایت اور تحفظ کا چلن ہے۔

انسان مذہب کی طرف امن اور سکون کے لیے آتا ہے۔ وہ خدا کے نام پر کھڑے لوگوں سے محبت اور رواداری کی توقع رکھتا ہے۔ وہ مذہبی لوگوں سے بے غرضی اور بے لوثی کی توقع رکھتا ہے۔ وہ انھیں عدل و انصاف کا علمبردار دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر ان چیزوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے جدید انسان مذہب سے بیزار ہو کر غیر مذہبی روحانیت کے دامن میں پناہ لے لیتا ہے۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ دین اسلام کو آج کے مسلمانوں کے بجائے اس کے اصل ماخذ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی لائی ہوئی تعلیم یعنی قرآن مجید میں دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ یہاں ہر وہ چیز پائی جاتی ہے جسے دور جدید کا انسان موجودہ روحانیت میں ڈھونڈ رہا ہے۔ عدل، احسان، انفاق، امن، ایثار، عفو و درگزر، محبت، ہمدردی، خیر خواہی، صبر، رواداری یہاں بنیادی اقدار ہیں۔ رب کی بندگی، اس کے بندوں سے حسن سلوک، والدین، اہل خانہ، پڑوسیوں، ماتحتوں سے حسن سلوک، عورتوں، بچوں، بزرگوں، محروموں، کمزوروں، یتیموں اور ضعیفوں سے نیک برتاؤ اسلام کی اصل پہچان ہے۔ رشتہ داروں، ضرورت مندوں، فقیروں، مسکینوں، مانگنے والوں اور سفید پوشوں کو اللہ کی رضا کے لیے اپنا مال دینا اس دین کی تعلیمات ہیں۔ وہ کام جنھیں ہر انسان بے ہودہ کہے، ہر شخص منکر سمجھے، ہر نفس؛ حق تلفی مانے، ہر ذی شعور فحش کہے، ہر بندہ زیادتی کہے یہاں ممنوع ہے۔

یہی اسلام ہے۔ یہی اصل روحانیت ہے۔ اسی کی آج کے انسان کو سب سے بڑھ کر ضرورت ہے۔ مگر یہ اسلام تو مسلمانوں کے لیے بھی اجنبی ہے۔ دوسروں کو وہ یہ اسلام کیا دیں گے۔

صدائے زندگی

پاکستانی معاشرے کے المیے کو اگر اختصار سے بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ اس قوم کی لیڈر شپ اور اشرافیہ کا ایک بڑا حصہ انتہائی مفاد پرست یا انتہائی بے بصیرت لوگوں پر مشتمل ہے۔ آج ہم جس حال میں ہیں اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی مجھ سے اس قوم کی خوش نصیبی جاننا چاہے تو وہ یہ ہے کہ اس کی مڈل کلاس کا ایک بڑا حصہ بہت مخلص اور درمند لوگوں پر مشتمل ہے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر مظہر اعوان کی زندگی اور ان کی کتاب ''صدائے زندگی'' اس دوسری بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے میری نیازمندی کا عرصہ ایک عشرے پر محیط ہے اور اس عرصہ میں انھیں میں نے شب و روز آنکھوں کے اس ہسپتال کے لیے جدوجہد کرتا ہوا پایا ہے جس کا مقصد معیاری علاج کو عام آدمی کی دسترس میں لانا ہے۔ بلاشبہ اس کام میں بہت سے اہل خیر نے ان کے ساتھ غیر معمولی تعاون کیا اور جدید ترین سہولیات سے آراستہ آنکھوں کے ہسپتال کے قیام کے لیے تمام ممکنہ وسائل فراہم کیے ہیں۔ تاہم اس منصوبے کے اصل ٹیم لیڈر وہی رہے۔ اب ان کی کتاب صدائے زندگی اس بات کا ایک دستاویزی ثبوت بن کر دنیا کے سامنے موجود ہے کہ دیانت کا بیج چاہے غربت کی زمین پر بویا جائے، مگر جب محنت اور یکسوئی کے پانی سے اسے سینچا جاتا ہے تو وہ سایہ دار درخت وجود میں آتا ہے جس سے دنیا فیض حاصل کرتی ہے۔

کتاب ڈاکٹر صاحب کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب کے ان بہت سے ذاتی احباب کے احوال کا بھی احاطہ کرتی ہے جو انھی کی طرح دیانت اور خدمت پر یقین رکھتے ہوئے معاشرے کو بہت کچھ دے رہے ہیں۔ ان میں سپریم کورٹ کے جج جناب جسٹس مشیر عالم جیسے معروف لوگ بھی شامل ہیں، مگر زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو خاموشی سے

معاشرے کو دیتے رہتے ہیں اور اپنا اجر اللہ سے پانے کے یقین کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے احوال پڑھ کر مجھے بے اختیار بابائے اردو مولوی فضل الحق یاد آئے جنھوں نے عام لوگوں کی آپ بیتی لکھنے کی طرح ڈال کر معاشرے کو اس تصور سے روشناس کرایا تھا کہ معاشرے کی اصل طاقت بادشاہ اور نامور لوگ نہیں ہوتے بلکہ وہ عام لوگ ہوتے ہیں جو اپنی سیرت و کردار سے معاشرے کا بھرم قائم رکھتے ہیں۔

آپ بیتی کے ساتھ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے ان مضامین پر بھی مشتمل ہے جو وہ مختلف موضوعات پر لکھتے رہے ہیں۔ یہ متنوع موضوعات پر مشتمل مضامین ہیں جو کئی پہلوؤں سے بڑے دلچسپ ہیں۔ مثلاً ایک مضمون اسلام آباد کے اس سفر کی روداد پر مشتمل ہے جو جہاز کے کاک پٹ میں بیٹھ کر کیا گیا۔ ایک مضمون بچوں کے ختم قرآن کے حوالے سے قرآن کو ترجمے کے ساتھ پڑھنے کی اہمیت پر ہے۔ اسی طرح دلچسپ انداز میں کئی چیزیں لکھی گئی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب علامہ اقبال کی اس دعا پر ختم ہو رہی ہے جو ہماری عمر کے تمام بچے اسکول میں پڑھتے رہے ہیں:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

یہ شاید اقبال کی اس نظم ہی کا فیض ہے کہ ڈاکٹر مظہر صاحب اور ان کی نسل کے لوگوں میں اپنے وجود کو جلا کر بھی معاشرے کو روشنی دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس رجحان کو زندہ رکھا جائے۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے حصے کی شمع روشن کر دے۔ اس بات سے بے نیاز کہ تاریک اندھیروں کے مقابلے میں ایک شمع کیا کر سکتی ہے۔ جب سب لوگ اپنی اپنی شمع جلائیں گے تو ہر اندھیرا دور ہو جائے گا۔

پروفیسر محمد عقیل

اے خدا تیرے بنا۔۔۔

اے میرے رب! اے میرے خدا! تیرے بنا زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔ تیرے بنا چاند کی روشنی تیرگی، سورج کی کرنیں بے نور، تاروں کی چھاؤں معدوم، فلک کی وسعت ایک تنگ گلی اور نیلگوں آسمان ایک سیاہ چادر ہے۔ تیرے بغیر پرندوں کی چہچہاہٹ ایک بے ہنگم شور، پھولوں کی مہک بے کیف بو، قوس قزح لایعنی لکیریں، باد نسیم صحرا کے تھپیڑے، پتوں کی سرسراہٹ بے معنی آواز، ساحل کی موجیں بے سبب یلغار اور بارش کے قطرے تپتے ہوئے سنگریزے ہیں۔

تیرے بغیر زیست بس سانسوں کا آنا جانا، دل محض گوشت کا لوتھڑا، عقل عیاری کی آماجگاہ، نگاہیں ابلیس کی پناہ گاہ اور بدن اک زندہ لاش ہے۔ تیرے بنا ہر حسن غلاظتوں کا ڈھیر، ہر رشتہ لایعنی تعلق، ہر انسان شیطان کا سایہ، اور ہر محفل اجڑا ہوا دیار ہے۔

تیرے بنا یہ نمازیں ریاکاری، یہ زکوٰۃ سانپوں کا ڈنک، یہ حج فقط اک یاترا اور یہ روزے احمقوں کا فاقہ ہیں۔ تیرے بنا تبلیغ محض ڈھونگ، تقریر نقلی پھولوں کا گلدستہ، حیا فقط تکلف، مذہبی پیشوائیت پنڈت کی دوکان، جہاد اک فساد، اذان ایک رسمی اعلان، جمعہ ایک لایعنی اجتماع اور عید ابلیس کی بزم ہے۔ تیرے بنا تفریح ایک بے ہودہ عمل، غناء ایک بے ہنگم شور اور سماج ایک جم غفیر ہے۔ تیرے بغیر کمانا ایک حرام عمل، لین دین استحصال کا ذریعہ، فلاح کا کام محض دکھاوا، تعلیم جہل کی بنیاد، کھانا پینا جانوروں کا فعل اور جنسی تعلق نری حیوانیت ہے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ تو ہو اور مرے من میں تجھ سا کوئی نہ ہو۔ تو نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ تو ہے تو سب کچھ ہے۔ تو ہے تو گلوں میں رنگ ہے، باد نو بہار ہے۔ ترنم ہزار ہے، بہار پر بہار ہے، ہوا بھی خوشگوار ہے۔ تو ہے تو نماز یہ معراج ہے، زکوٰۃ بہت پاک ہے، صوم اک نکھار ہے، حج اک خمار ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرے شب و روز میں آ، میرے تکلم میں سما، میری سماعتوں کو جگا، میری نگاہوں میں بس جا، میری نیندوں کو سجا، میرے سجدوں کو بسا، مجھ کو راتوں میں اٹھا، رگ جاں سے بھی قریب آ اور پھر دور نہ جا۔

شمائلہ عثمان

حکمت اور ہدایت

ہمارے معاشرے میں جو غلط روایات عام ہیں ان میں سے ایک مثال واقعات اور چیزوں کا غلط وقت اور غلط جگہ پر استعمال ہے ۔ اس غلط استعمال اور انطباق سے ان مثالی چیزوں کی افادیت پر منفی اثر پڑتا ہے اور معاشرہ کو بھی فائدے کے بجائے نقصان ہوتا ہے ۔ اس غلط انطباق (Application) کی مثال ایسے ہی ہے جیسے سر درد میں اسہال کی دوا کھانا، یا دل کی تکلیف کا علاج کیموتھراپی سے کرنا وغیرہ۔

معاشرے میں ایسی بے شمار کمزوریاں ہیں جنہیں مذہب کے ساتھ نتھی کر کے بے علم اور بے شعور ذہنوں کو غلط رہنمائی دی جا رہی ہے۔ مثلاً جہاد جیسے عظیم اسلامی حکم کی فضیلت ،ضرورت، حکمت اور افادیت کو توڑ موڑ کر خود کش بمباری میں معصوم انسانوں کے قتل کے جواز میں پیش کرنا۔ جہیز جیسی لعنت کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی نسبت دے کر غریبوں پر نا قابل برداشت بوجھ ڈال دیا گیا۔قوانین وراثت میں کمزور اور خواتین کے حقوق سلب کرنے کے لیے قرآن سے شادی اور دیگر جاہلانہ رسوم کو رواج دیا گیا۔خواتین سے متعلق بعض احکام کو غلط رنگ دے کر خواتین کو معاشرے کا فعال رکن بننے سے روکا گیا، چار شادیوں کی اجازت کی حکمت،شرائط اور پس منظر جانے بغیر اپنی عیاشیوں کے لیے استعمال کرنا وغیرہ۔

آج کل کم عمری کی شادی موضوع بحث ہے جس میں خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شادی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔کیا صرف حوالہ یا مثال دے دینا کافی ہے؟ یا اللہ کی مرضی اور حکمت کو جاننا بھی ضروری ہے۔صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رشتہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشا سے ہوا تھا جس میں بہت حکمت اور مصلحت تھی۔مگر لوگ ان

ساری حکمتوں اور مصلحتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور صرف کم عمر خاتون سے بڑی عمر کے فرد کا حکم اخذ کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس رشتہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تربیت کے لیے ایک انتہائی ذہین اور کم عمر خاتون کا انتخاب کیا گیا تھا تا کہ آپ کے بعد وہ آپ کی ذاتی زندگی کے بارے میں لوگوں کی رہنمائی کر سکیں۔ ہر شخص جان سکتا ہے کہ ایک ٹین ایجر کی ذہنی صلاحیت ایک زیادہ عمر کے انسان کی ذہنی صلاحیت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی رفاقت کا عرصہ ایک سیکھنے والے ذہن کے لیے بہترین وقت تھا۔ اسی طرح سکھانے والی شخصیت کے لیے یہ بہترین وقت تھا کہ اس وقت مدینہ میں ہر طرح کے حالات پیش آ رہے تھے۔ پھر ایک مرد کی شخصیت کے سارے روپ جتنا کھل کر بیوی کے سامنے آ سکتے ہیں کسی اور رشتے میں ممکن نہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ کی باقی عمر امت کی رہنمائی کے لیے وقف تھی۔ صحابہ کرامؓ بھی بعض معاملات میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے رہنمائی حاصل فرماتے تھے۔

سیدہ رضی اللہ عنہا کا یہی رول تھا جس کی بنا پر آپ کو اولاد پیدا کرنے کی بہترین عمر کے باوجود کوئی اولاد نہیں دی گئی تا کہ آپ کی ساری توجہ علم کی طرف مبذول رہے۔ یہی رول آپ کی باقی ازواج مطہرات کا بھی تھا لیکن سیدہ کی ذہانت اور سیکھنے والی عمر کی بنا پر ان کا کردار سب سے نمایاں تھا۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر مثال ظاہری طور پر ہر شخص پر صادق نہیں آتی ۔ اس کے پس منظر اور حکمت میں ہمارے لیے ہدایت ہے۔

ابو یحییٰ

رمضان اور ہمارے اخلاقی معاملات

رمضان مبارک کی مقدس ساعتیں ہم پر سایہ فگن ہورہی ہیں۔قمری اور شمسی مہینوں کے فرق کی بنا پر اب کئی برس تک رمضان کا مہینہ موسم گرما میں آیا کرے گا۔تاہم ایک طویل عرصے سے کی جانے والی مذہبی سرگرمیوں کے نتیجے میں مسلمان عبادات کے بارے میں اب کافی حساس ہو گئے ہیں۔لہٰذا امید ہے کہ انشاء اللہ سخت ترین گرمی کے موسم میں بھی مسلمانوں کی غالب اکثریت موسم کی شدت اور روزے کی طوالت کے باوجود اس عظیم عبادت کو پوری ہمت اور یکسوئی کے ساتھ ادا کرے گی۔تاہم اس کے ساتھ سابقہ تجربات ومشاہدات کی بنیاد پر یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ روزے کے ساتھ وہ ساری اخلاقی خرابیاں جوں کی توں جاری وساری رہیں گی جنھوں نے ہمارے معاشرے کوظلم وفساد سے بھر دیا ہے۔

ہمارے ہاں کے ایک مذہبی انسان کا تصور

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں مذہبی انسان کا جو تصور ہے وہ کچھ ظاہری چیزوں اور عبادات کے ظاہری ڈھانچے تک محدود ہے۔عبادات بلاشبہ دین کا اہم ترین اور بنیادی دینی مطالبہ ہے۔لیکن جس طرح قلبی ایمان کے بغیر کلمہ پڑھ لینا ایک بے فائدہ عمل ہے،اسی طرح اپنی اصل روح کے بغیر یہ عبادات حقیقی فائدہ نہیں دے سکتیں۔یہ بات کوئی ہم نہیں کہہ رہے دین دینے والی ہستی نے اس حقیقت کو مختلف پہلوؤں سے کھولا ہے۔خود روزہ کے حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”جس شخص نے (روزہ رکھ کر) جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہیں چھوڑا تو اللہ کو اس

کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔‘‘،(صحیح بخاری، رقم 1804)

یہ روایت صاف بیان کرتی ہے کہ روزہ اطاعت کی جس اسپرٹ اور تقویٰ کے جس مقصد کے لیے رکھا جاتا ہے وہ مقصد اگر پورا نہیں کیا جارہا تو پھر صرف بھوکا پیاسا رہنا وہ عمل نہیں جو اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے مقصود ہو۔

قرآن کا مطلوب انسان

مزید یہ کہ عبادات کے ساتھ دین کے بہت سے اہم اخلاقی مطالبات ہیں جن سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے۔ ان میں سے چند اہم مقامات کو میں نے اپنی کتاب ’’قرآن کا مطلوب انسان‘‘ میں جمع کر دیا ہے۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ دین آخرت کی نجات اور دنیا میں اعلیٰ شخصیت کے پیدا ہونے کی ضمانت انہی مطالبات کی بنا پر دیتا ہے۔ ان کو نظر انداز کر کے کوئی شخص کبھی بھی حقیقی دیندار نہیں بن سکتا۔ نہ ان کے بغیر آخرت کی فلاح ممکن ہے نہ دنیا ہی میں اعلیٰ انسان پیدا ہو سکتے ہیں جو کسی معاشرے کو عدل وانصاف اور نتیجے کے طور پر اللہ کی رحمتوں سے بھر دیتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں یہ سانحہ ہے کہ ہمارے دینی فکر میں یہ اخلاقی مطالبات غیر اہم ہیں۔ تاہم اگر دین کے اصل ماخذ کو پڑھا جائے تو اس معاملے میں کسی قسم کی غلط فہمی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

خود روزے کی عبادت کی تفصیل جس طرح قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے اس سے یہ حقیقت صاف واضح ہو جاتی ہے یہ اخلاقی مطالبات عبادات جتنے ہی اہم ہیں بلکہ عبادات اور خاص کر روزے کی عبادت کے بیان کے ضمن میں اس حقیقت کو بالکل کھول دیا گیا ہے کہ اس عظیم عبادت کا مقصد ہی لوگوں کو ان اخلاقی مطالبات کی ادائیگی کے لیے تیار کرنا ہے۔

رمضان اور اخلاقی رویے

روزہ کا حکم قرآن مجید کی سورہ بقرہ میں دیا گیا ہے۔ یہ کئی پہلوؤں سے قرآن مجید کی اہم ترین سورت ہے۔ اس سورت کے آغاز میں بنی اسرائیل کو ان کے جرائم اور خاص کر بے خوفی (عدم تقویٰ) کی نفسیات کی بنا پر امامت عالم کے منصب سے فارغ کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک نئی امت یعنی امت مسلمہ کو اس منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ جس کے بعد نئی امت کو ایمان و اخلاق کی بہترین حالت میں لانے کے لیے ہدایات اور خاص کر اپنی سب سے بڑی نعمت یعنی شریعت عطا کی گئی ہے۔

روزوں کا حکم شریعت کے قوانین کے اسی سلسلہ بیان میں رکھا گیا ہے۔ مگر وہ جس طرح اور جس ترتیب سے بیان کیا گیا ہے اس کا سمجھنا بہت اہم ہے۔ روزہ سے قبل اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لیے قصاص کا حکم دیا (آیت 179-177)۔ یعنی قاتل کو اس جرم میں سزائے موت دی جائے۔ اس کی طاقت اور سماجی حیثیت سے قطع نظر قاتل جو بھی ہو اسے بہرحال سزا ضرور ملنی چاہیے۔ پھر جان کے بعد مال کی حرمت کے حوالے سے احکام شروع ہوتے ہیں (آیت 182-181)۔ عرب میں طاقتور وارث کمزوروں کو وراثت کے مال سے محروم کر دیتے تھے۔ چنانچہ اس ظلم کو روکنے کے لیے ایک ابتدائی حکم یہ دیا گیا کہ مرنے والا اپنی زندگی کے آخری مرحلے میں جب موت قریب ہو تو یہ معاملہ طے کر کے جائے۔

دونوں احکام کے ضمن میں تقویٰ کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جان کا معاملہ ہو یا مال کا، انسان ایک دفعہ بے خوفی کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے دوسروں پر ظلم و تعدی سے نہیں روک سکتی۔ اللہ کا طریقہ تو یہ ہے نہیں کہ وہ دنیا میں ہاتھ پکڑ کر لوگوں کو ظلم و زیادتی سے روکے۔ رہے انسان تو ان میں سے جو طاقتور ہو گا وہ اپنی من مانی کرلے گا۔ جہاں موقع ملے گا وہ لوگوں کی جان اور مال پر ظلم ڈھائے گا۔ ایسے میں صرف عدل پر مبنی احکام اور تقوی

کی نفسیات ہے جو معاشرے کو اس ظلم سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو انتہائی منصفانہ احکام دیے گئے اور دوسرے طرف تقویٰ کی اہمیت کو بیان کیا گیا۔

مگر تقویٰ کی اہمیت کے ساتھ یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ یہ پیدا کیسے ہوگا۔ چنانچہ اسی مقصد کے لیے یہ اہتمام کیا گیا کہ مال سے متعلق احکام ابھی ختم نہیں ہوئے کہ تقویٰ کی اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لیے بیچ ہی میں آیات 183 تا 187 میں روزہ کی وہ عظیم عبادت فرض کی گئی جس کا مقصد ہی تقویٰ پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا۔

''ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ تم اللہ سے ڈرنے والے بن جاؤ۔(البقرہ 183:2)

یہ روزہ سے متعلق پہلی آیت ہے اور اس سلسلہ کلام کی آخری آیت کے الفاظ یہ ہیں۔

اللہ اسی طرح اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تا کہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔، (البقرہ 187:2)

یعنی بات تقوی سے شروع ہوئی اور تقوی پر ہی ختم ہوئی۔ یہی تقوی یا خدا خوفی جو ہر سرد و گرم میں انسان کو اطاعت پر آمادہ کرتی ہے روزے کا اصل مقصود ہے۔ پھر روزہ کے بعد بغیر کسی وقفے کے وہی حرمت مال کا موضوع پھر اٹھا لیا جس پر پہلے گفتگو ہو رہی تھی۔ ارشاد فرمایا:

اور اپنے مال باہمی طور پر باطل طریقے سے مت کھاؤ۔(البقرہ 188:2)

اس طریقے کی حکمت

احکام کی یہ ترتیب اس بات کا صاف اعلان ہے کہ معاشرے میں اگر ظلم ہو رہا ہے، قاتل آزاد ہیں بے لگام ہیں، قصاص نہیں لیا جا رہا، انسانی جان کی حرمت ہر روز پامال ہو رہی ہے، معصوموں کو قتل کیا جا رہا ہے اور مجرم دندناتے پھر رہے ہیں، دہشت گردی اور خوف کی فضا عام ہے، مجرموں کو تحفظ دیا جا رہا ہے، طاقت و رطاقت کے زور پر اور اہل علم قلم اور زبان کی طاقت پر

قاتلوں کا تحفظ کر رہے ہیں، عدالتوں میں عدل نہیں ہو رہا بلکہ وہیں پر بے گناہوں کو سنگسار کیا جا رہا ہے۔

لوگوں کا مال اگر باطل طریقے پر کھایا جا رہا ہے، ان کی زمینوں پر قبضے ہو رہے ہیں، بھتہ اور تاوان وصول کیا جا رہا ہے، ملاوٹ عام ہے، ظالمانہ منافع خوری، رشوت، لوٹ مار، کرپشن کا کلچر اگر عام ہے، تو اطمینان رکھیے اس معاشرے کے لوگ کتنے ہی روزے رکھ لیں۔ اللہ کے ہاں کوئی روزہ قبول نہیں ہو رہا۔ کچھ کا اس لیے کہ وہ روزہ رکھ کر اس ظلم میں حصہ دار ہیں اور کچھ کا اس لیے کہ وہ اس ظلم کے خلاف خاموش ہیں۔ روزہ صرف اس محدود اقلیت کا قبول ہوگا جن کے دل میں صرف خدا کا خوف ہوگا اور ہر دوسرے خوف سے بلند ہو کر اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔

وہ دہشت گردی کو دہشت گردی کہیں گے۔ وہ ظلم کو ظلم کہیں گے۔ قتل کو قتل کہیں گے۔ بھتہ و تاوان کو بھتہ کہیں گے۔ کرپش کو کرپشن کہیں گے۔ زمینوں پر قبضہ کو حرام کہیں گے۔ ظالمانہ منافع خوری، رشوت، کرپشن کے خلاف سینہ سپر ہو کر کھڑے رہیں گے۔

باقی جو لوگ یہ سب کام کرتے ہیں اور عین رمضان میں اس ظلم و ستم کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ اطمینان رکھیں۔ روزہ کا نتیجہ اس دنیا میں تقوی ہے۔ اگر وہ نہیں نکل رہا تو آخرت والا نتیجہ بھی نہیں نکلے گا۔ وہ جنت میں نہیں جائیں گے۔ ان کا انجام جہنم کی آگ ہے۔ کیونکہ انھوں نے میرے آقا کے فرمان کے مطابق روزہ تو رکھ لیا، مگر روزہ رکھ کر جھوٹ، ظلم، ناانصافی کو نہیں چھوڑا۔ وہ دنیا میں نافرمانی سے نہیں بچے تو آخرت میں جہنم سے بھی نہیں بچ سکتے۔ وہ اپنے آپ کو کچھ بھی کہتے رہیں اور کچھ بھی سمجھتے رہیں۔ یہی ان کا انجام ہے۔

سوال وجواب

ابو یحییٰ

شب قدر اور چاند کی تاریخ کا فرق

سوال:

السلام علیکم۔ ابو یحییٰ صاحب۔ اگر کسی اور صاحب علم سے یہ سوال پوچھوں تو ہوسکتا ہے وہ مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا دیں۔ لیکن ہمارا دین تو سوال پوچھنے سے روکتا نہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عظمت اور بڑائی سے ہرگز ہرگز انکار نہیں۔ وہ عظیم ہیں وہ کریم ہیں۔ جو چاہتے ہیں بے شک کر سکتے ہیں۔ سوال بس اتنا سا ہے کہ ہر سال چاند کا نکلنا اور نہ نکلنا ایک معمہ بنا ہوتا ہے۔ ایسے میں ہم بائی چانس لیلۃ القدر کو ضائع کر سکتے ہیں۔ جو اللہ کے نیک بندے ہیں ان کو تو علامات نظر آ جاتی ہیں۔ جو مجھ جیسے گناہگار ہیں وہ تو خسارے میں رہ گئے۔ بالفرض عرب میں لیلۃ القدر 25 رمضان کو ہوئی۔ پاکستان میں وہ 24 کو ہوگئی۔ میں تو بس یہی سوچ رہی تھی کہ یہ رات ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ جو اس کو پا لے وہ بڑا خوش قسمت ہے۔ جو اس کو ڈھونڈھتا ڈھونڈھتا کسی اور رات میں آہ وزاری کرتا رہے اس کے لیے کیا معاملہ ہے؟ دعا کی کیفیت کسی وقت بہت اچھی ہوتی ہے۔ کبھی اس قدر اچھی نہیں ہوتی۔

یہ قیمتی راتیں ہیں۔ میں آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی۔ جب آپ مناسب سمجھیں جواب دیں۔ بشرط زندگی اگلے سال رمضان میں آپ کا جواب میرے لیے کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔ جزاک اللہ خیراً کثیراً

سارہ

جواب:

شب قدر کو قرآن مجید میں جس حیثیت میں بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ وہ رات ہے جس میں تمام پر حکمت فیصلے فرشتوں کے حوالے کیے جاتے ہیں۔ اپنے فیوض و برکات کی بنا پر یہ رات ہزار ماہ سے افضل ہے۔ اس میں قرآن مجید جیسی اعلیٰ کتاب کا نزول شروع ہوا۔ اس پس منظر کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس رات میں عبادت پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ مگر یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ شب قدر کس خاص رات میں ہوتی ہے۔ بعض روایات میں رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں اسے تلاش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اس پس منظر میں ہمیں طاق راتوں میں عبادت سے اللہ کا قرب ڈھونڈنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ جس وقت آپ پر کیفیت طاری ہو وہی آپ کے لیے شب قدر ہے۔ کیونکہ اس وقت اللہ تعالیٰ انتہائی توجہ سے آپ کی بات سنتے ہیں۔

ہمیں اصول یہ بنانا چاہیے کہ ان راتوں میں ممکنہ حد تک عبادت سے اللہ کا قرب تلاش کریں ۔ اگر ہمیں یہ رات مل بھی گئی تو ہمیں پتا نہیں چلے گا۔ اس لیے علامات و نتائج سے بے پروا ہو کر سیرت طیبہ کی پیروی کرنی چاہیے۔ کیفیت طاری ہو جائے تو اچھی بات ہے ورنہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو اللہ کے حضور حاضر ہو گیا وہ کبھی محروم نہیں رہتا۔

باقی بات یہ رہی کہ رویت ہلال کے اختلاف کی وجہ سے یا جغرافیائی فرق کی وجہ سے 25 یا 24 تاریخ کا فرق ہوگا تو کیا ہوگا۔ اس حوالے سے عرض یہ ہے کہ دراصل یہ معاملہ کس طرح ہوتا ہے یہ امور متشابہات کی نوعیت کی چیز ہے۔ مسئلہ 24 یا 25 ہی کا نہیں ہم تو یہ بھی جانتے ہیں کہ جس وقت دنیا کے ایک حصے میں رات ہوتی ہے عین اسی وقت دوسرے میں دن ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے ہمیں اس کی کوئی متعین تاریخ یا دن نہیں بتایا گیا۔ یہ تعبیرات ہمیں سمجھانے کے لیے

استعمال کی جاتی ہیں۔اصل معاملہ اللہ ہی جانتا ہے۔ہمیں تو اپنی طرف سے حتی الوسع کوشش کرنی چاہیے کہ جو سیرتِ رسول علیہ السلام ہے اسی کی پیروی کریں۔باقی معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اطمینان رکھیے وہ کسی کی سعی نہ رائگاں جانے دیتا ہے نہ کسی کے ساتھ ذرہ برابر زیادتی ہی کرتا ہے۔

والسلام علیکم

ابو یحییٰ

دین میں اختلافات اور فرقہ واریت

سوال

قرآن اور شریعت کے احکامات اتنے واضح نہیں ہیں کہ اس میں کوئی بحث کی گنجائش ہی نہ ہو اور یہ فرقے اور مسلک نہ ہوں۔ان فرقوں اور مسالک کی اسلام کو یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یا اللہ کو کیوں ضرورت پیش آئی جب کہ اسلام ایک فائنل دین ہے۔یہ شک وشبہات کیوں رکھے گئے؟ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی ان تفرقات کا بتایا کہ ایسا ہوگا۔مگر کیوں؟

جواب:

محترم بھائی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ تاثر کہ اسلام کے احکام یا شریعت واضح نہیں اور ان کی بنا پر مسلمانوں میں اختلاف پایا جاتا ہے یا فرقہ بندی ہوتی ہے، درست نہیں۔میں نے اپنی ''کتاب قرآن کا مطلوب انسان'' میں وہ سارے احکام جمع کردیے ہیں جو ایک عام فرد سے مطلوب ہیں اور جن کی بنیاد پر قیامت

کے دن اس کی جنت یا جہنم کا فیصلہ ہو جائے گا۔ایسے تمام احکام میں ذرہ برابر نہ اختلاف ہے نہ کوئی شک اور الجھن ۔مثلاً اعتقادات یعنی توحید، رسالت اور آخرت، عبادات، اخلاقیات وغیرہ جو اصل میں سزا جزا کی اساس ہیں اس میں اس امت میں سرے سے کوئی اختلاف نہیں۔کوئی گروہ اگر اختلاف کرتا بھی ہے تو قرآن کریم ان میں اتنا واضح ہے کہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اختلاف کرنے والے قرآن کے بجائے خواہش نفس کی پیروی کر رہے ہیں۔

جہاں تک معاملہ بعض جزوی احکام کا ہے تو اطمینان رکھیے ان کی بنیاد پر قیامت کی جوابدہی نہیں ہوگی۔ یہ علمی نوعیت کے مسائل ہیں۔ ہمارے ہاں غلطی یہ ہوئی ہے کہ ان علمی اور فروعی مسائل کو عوام الناس میں لے جایا جاتا ہے اور انہی کو دین کا اصل مسئلہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ عوام ان کو نہیں سمجھ سکتے لیکن ان کے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہو جاتا ہے کہ دین کے بنیادی مسائل میں بہت اختلاف ہے۔حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔اس لیے ہمیں اس طرح کے فروعی مسائل کو بنیاد بنانے کے بجائے دین پر عمل کے لیے ایمان، عبادات اور اخلاقیات کی نوعیت کے احکام پر توجہ کرنا چاہیے۔اسی طرح جب جب شریعت کے کسی حکم پر عمل کا موقع ہو جیسے وراثت کی تقسیم یا نکاح طلاق اور دیگر معاملات تو ان تمام امور پر شریعت کی روشنی میں عمل کرنا چاہیے۔اس کے لیے ضروری علم دین حاصل کرنا چاہیے۔اس کے بعد کوئی الجھن انشاءاللہ باقی نہیں رہے گی۔

اہم یہ نہیں کہ رمضان میں آپ نے کیا اعمال کیے
اہم یہ ہے کہ رمضان کی تربیت نے آپ کو کیسا بنا دیا (ابویحییٰ)

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (9)

دلائل آخرت: فطرت کی دلیل

انکار آخرت: ایک مقبول نظریہ

انکار آخرت دور حاضر کا مقبول ترین نظریہ ہے۔ آج کل کے مذہبی لوگ ہوں یا غیر مذہبی ان سب کی تگ و دو کا اصل مقصود اسی دنیا کی فلاح اور ترقی ہے۔ کچھ لوگ یہ کام مذہب کی نفی کر کے کرتے ہیں اور باقی مذہب کو مانتے ہوئے بھی کرتے ہیں۔ جو لوگ مذہب کا انکار کرتے ہیں، ان کو تو جانے دیجیے کہ وہ دنیا ہی کو مرنے اور جینے کی آخری جگہ مان چکے ہیں، مگر مذہب کے نام لیوا بھی ایسے نظریات سے اتنے متاثر ہو چکے ہیں کہ وہ منکرین آخرت کے جواب میں کوشش یہی کرتے ہیں کہ مذہب کا اصل مقدمہ ہی یہ ثابت کریں کہ وہ فرد و اجتماع دونوں کی دنیوی زندگی کو بہتر بنانے آیا ہے۔ اس کا نصب العین دنیا کو جنت بنانا ہے۔ بلاشبہ مذہب اسلام کی تعلیم کی یہ خصوصیت ہے کہ اس پر عمل کے بعد فرد اور اجتماع دونوں کے دنیوی معاملات بہتر ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ ایک ثانوی نتیجہ ہے۔ دین کا اصل مقصد نہیں۔ دین کا اصل مقصد آخرت کی زندگی کے لیے لوگوں کو تیار کرنا ہے جہاں اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے سوا کسی اور طریقے سے کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ رہی دنیا تو یہ آزمائش کی جگہ ہے جہاں سے موت، بیماری، غم، ظلم، فساد نہ کبھی ماضی میں ختم ہوئے ہیں نہ مستقبل میں ختم ہوں گے۔ ہم انھی معاملات میں آزمائے جاتے ہیں اور ان حالات میں ہمارا رویہ ہی آخرت میں ہماری نجات یا ہماری گرفت کا ذریعہ بنے گا۔

فردوس کی تلاش

تاہم یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان فطری طور پر اس دنیا میں دکھ، غم، پریشانی، بیماری، موت، بڑھاپے اور اس نوعیت کی ہر چیز کو ناپسند کرتا ہے جو اس کی زندگی کو مشقت میں ڈال دے۔ انسان خوشی چاہتا، آسائش پسند کرتا، آسانی کی خواہش رکھتا، راحت اور سکون کی تمنا کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی نقصان سے بچنے اور منفعت حاصل کرنے کے اصول پر گزارتا ہے۔ اوپر جن لوگوں کا ذکر ہم نے کیا کہ یہ لوگ دنیا ہی کو جنت بنانے کے خواہش مند ہیں؛ ان کی یہ خواہش غیر حقیقی سہی، مگر غیر فطری ہرگز نہیں ہے۔ ابدی زندگی، عیش جاوداں، لذت کامل، راحت مسلسل اور بے غم زندگی وہ انسانی خواب ہے جس کی تعبیر تو آج تک نہیں ملی، مگر انسانیت نے ایک دن کے لیے بھی اس خواب سے دامن نہیں چھڑایا۔ جس کو جتنا موقع ملا اِس نے دنیا میں اپنے لیے اتنی ہی جنت بنالی۔ وسیع و عالی شان محلات، بڑی بڑی جاگیریں، سرسبز و شاداب سیرگاہیں، بہترین سواریاں، سونے چاندی کے ڈھیر، مستعد خدام، نوخیز شباب کی حامل حسین عورتیں، نشہ آور شراب کی لذت، تفریح و مستی، آرام و سکون، دولت و طاقت، حکومت و اقتدار غرض انسان نے ان سب چیزوں کے ذریعے سے اس دنیا میں ہمیشہ اپنی فردوس گمشدہ کو تلاش کرنا چاہا اور آج تک کیے جارہا ہے۔ مگر یہ جنت ہاتھ نہیں آتی۔ کبھی کسی کو لمحہ بھر کو مل بھی جائے تو پھسلتی ریت کی مانند خاموشی سے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔

انسان کے اندر اس جنت کی طلب اتنی فطری ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں۔ انسان کو صرف اس کا تعارف کرانے کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید نے جس وقت آخرت کو فطری بنیادوں پر ثابت کرنا شروع کیا ہے تو کچھ نہیں کیا، بس آخرت کی زندگی کا نقشہ سامنے رکھ دیا۔ لوگ لاکھ قیامت کا انکار کریں، اسلام کو رد کریں، پیغمبر کا مذاق اڑائیں، آخرت کو نہ مانیں، مگر کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ انھیں جنت نہیں چاہیے۔ وہ ابدی جوانی، عیش لازوال، صحت و

عافیت سے بھرپور زندگی، مستی و سرور سے عبارت آزادی کے خواہش مند نہیں ہیں؟ وہ درد و غم، اندیشہ و حزن، خوف و خطر، زحمت و نقصان، دکھ اور الم، اذیت اور مصیبت، سختی اور تکلیف، گھبراہٹ اور مایوسی، پشیمانی اور پچھتاوے، ڈر اور محرومی کے ہر سائے سے محفوظ دائمی زندگی کے خواہاں نہیں ہیں؟ ایسا ہے تو پھر بلا شبہ آخرت کا انکار ان کا حق بنتا ہے اور اس کی دعوت ایک فریب کے سوا کچھ نہیں، مگر انسان صبح و شام اسی جنت کی تعمیر کے منصوبے بناتا اور اٹھتے بیٹھے اسی کے خواب دیکھتا ہو تو اس خواب کی تعبیر دکھانے سے زیادہ فطری دعوت اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہی آخرت اسلام کی بنیادی دعوت اور مذہب کا بنیادی مقدمہ ہے۔

انسانی ضمیر کی گواہی

انسان کے اندر جنت کی طلب کی طرح ایک دوسری چیز بھی فطرت انسانی کا جزو لاینفک ہے۔ یہ انسانی ضمیر اور اس کے اندر پیوست سزا جزا کا تصور ہے۔ انسان نے ہر دور میں اپنی زندگی کا نقشہ اسی اصول کے مطابق بنایا ہے۔ انسانی ضمیر اخلاقی بنیادوں پر خیر و شر کا ایک بھرپور تصور اپنے اندر رکھتا ہے اور اس بنیاد پر ہمیشہ سزا و جزا کا قائل رہا ہے۔ انسان ظلم کو فطری طور پر برا سمجھتا ہے اور چوروں اور قاتلوں کو اسی ظلم کی بنیاد پر سزا دیتا ہے۔ جھوٹ، بددیانتی، ناانصافی، بدعہدی، خیانت، غبن وغیرہ ہر دور، ہر نسل اور ہر گروہ میں برائی سمجھے گئے ہیں۔ ان کے ارتکاب پر ہمیشہ انسانی ضمیر نے آواز اٹھائی ہے اور معاشرے نے انھیں برا سمجھا ہے۔ اسی طرح سچ، ہمدرری، احسان، رحم، محبت، امانت، دیانت، ایثار، قربانی جیسی چیزیں اعلی انسانی اقدار سمجھی گئی ہیں اور ان کو زندگی بنانے والے اپنے عمل کی داد سب سے پہلے اپنی فطرت سے پاتے ہیں اور پھر سارا معاشرہ ان کی تحسین کرتا ہے۔ اسی اصول پر ہم بچوں کو کامیابی پر انعام دیتے، مزدور و ملازم کو تنخواہ دیتے اور ملک و قوم کے لیے جاں نثار کرنے والوں کو اعلیٰ قومی اعزاز سے نوازتے ہیں۔

تاہم جس طرح فردوس ارضی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا، اسی طرح عدل وانصاف کے تقاضے بھی کبھی اس دنیا میں پورے نہیں ہو سکے ہیں۔ ایک قاتل کی جان لینے سے مقتول کی زندگی واپس آسکتی ہے نہ اس کے خاندان کا نقصان پورا ہوسکتا ہے۔ ریپ اور گینگ ریپ کے مجرم کو کون سی سزا اس معصوم عفیفہ کے دکھ کا ازالہ کرسکتی ہے جس کا سامنا اسے کرنا پڑا ہے۔ یہ تو سزا ملنے کا ذکر ہے، اکثر تو اس دنیا میں ظالموں کو سزا ہوتی نہ قاتلوں کو پکڑا جاتا ہے۔ کرپٹ لیڈر یہاں حکمران بن جاتے ہیں اور ظالم لوگ بادشاہ۔ مفاد پرست عیش کرتے ہیں اور ایثار کرنے والے دکھ اٹھاتے ہیں۔ محنت کرنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں اور چوری کرنے والے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ایسے میں فطرت انسانی چیخ چیخ کر یہ کہتی ہے کہ ایک دنیا اور بننی چاہیے جہاں عدل کامل ہو۔ جہاں مجرموں کو ان کے کیے کی مکمل سزا ملے۔ اور جہاں نیکوں کاروں کو ان کی نیکی، صبر، ہمدردی، احسان اور ایثار کے صلے میں وہ فردوس ملے جو انسانیت کا خواب ہے۔ قرآن اپنا مقدمہ ٹھیک اسی جگہ سے اٹھاتا ہے اور اتنے کمال طریقے سے اٹھاتا ہے کہ دو جملوں میں کل داستان ختم۔ گرچہ اس کی تفصیل سے بھی قرآن بھرا پڑا ہے۔ چنانچہ قیامت کے جھٹلانے والوں کے جواب میں قرآن مجید اپنا کل فطری مقدمہ جو ہم نے دو نکات کی شکل میں اوپر تفصیل سے بیان کیا ہے انتہائی مختصر اور جامع انداز میں یوں بیان کرتا ہے۔

قرآنی بیانات

’’(یہ قیامت کو جھٹلاتے ہیں)؟ نہیں (وہ تو ہو کر رہے گی اور اس کے لیے)، میں قیامت کے دن کو گواہی میں پیش کرتا ہوں اور نہیں (یہ کیسے جھٹلا سکتے ہیں) میں (ان کے اندر) ملامت کرنے والے نفس کو گواہی میں پیش کرتا ہوں۔‘‘، (القیامہ 75:2-1)

اس سورہ قیامت سے اگلی سورت یعنی الدھر (76) میں قرآن مجید ایک دوسرے انداز سے فطرت کی اس دلیل کو اس کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ پہلے وہ بتاتا ہے کہ ہم نے انسان کو خیر و شر کا شعور دیا اور ساتھ میں یہ اختیار بھی کہ چاہے تو شکر گزاری کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو ناشکری کی۔ اس کے فوراً بعد جہنم کا نقشہ اختصار سے اور اس فردوس گمشدہ کا نقشہ بڑی تفصیل سے اس کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

''ہم نے کفر کرنے والوں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ہاں، وفادار بندے ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں چشمۂ کافور کی ملونی ہوگی۔ اس چشمہ سے اللہ کے خاص بندے پئیں گے اور اسی کی شاخیں نکال لیں گے جدھر جدھر چاہیں گے۔ یہ اپنی نذریں پوری کرتے اور اس دن سے ڈرتے رہے ہیں جس کا ہول ہمہ گیر ہوگا اور وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے رہے ہیں۔ خود اس کے حاجت مند ہوتے ہوئے۔ (اس جذبہ کے ساتھ کہ) ہم تمھیں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں، نہ تم سے کسی بدلے کے طالب ہیں نہ شکریہ کے، ہم اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے دن سے اندیشہ ناک ہیں جو نہایت عبوس اور سخت ترش ہوگا۔ تو اللہ نے ان کو اس دن کی آفت سے بچایا اور ان کو تازگی اور سرور سے نوازا۔ اور انھوں نے جو صبر کیا اس کے صلہ میں ان کو جنت اور ریشمیں لباس عطا فرمایا۔ ٹیک لگائے ہوں گے اس میں تختوں پر۔ نہ اس میں گرمی کے آزار سے دوچار ہوں گے نہ سردی کے۔ باغِ جنت کے سائے ان پر جھکے ہوئے اور اس کے خوشے بالکل ان کی دسترس میں ہوں گے۔ اور ان کے سامنے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے۔ شیشے چاندی کے ہوں گے۔ ان کو انھوں نے نہایت موزوں اندازوں کے ساتھ سجایا ہوگا۔ اور وہ اس میں ایک اور شراب بھی پلائے جائیں گے جس میں ملونی چشمۂ زنجبیل کی ہوگی۔ یہ اس میں ایک چشمہ ہے جو سلسبیل سے موسوم ہے اور ان کی خدمت میں

غلمان گردش میں ہوں گے جو ہمیشہ ایک ہی سِن پر رہیں گے۔ جب تم ان کو دیکھو گے تو ان کو بکھرے ہوئے موتی گمان کرو گے۔ جہاں دیکھو گے وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے۔ ان کے اوپر سندس کا سبز اور استبرق کا لباس ہوگا اور وہ چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب ان کو پاکیزہ مشروب پلائے گا۔ بے شک یہ تمھارے عمل کا صلہ ہے اور تمھاری سعی مقبول ہوئی۔ (سورہ الدھر 76:3- 22)

فطرت انسانی میں خیر وشر کے اس شعور کو دوسرے مقامات پر ''نفس میں نیکی و بدی کے الہام''، (الشّمس 91:8) اور ''دونوں راستوں کی طرف رہنمائی''، (البلد 90:10) سے تعبیر کیا ہے۔ جبکہ اس خیر وشر کی بنیاد پر کامل سزا و جزا پر مبنی آخرت کی ابدی دنیا کا نقشہ قرآن کریم میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ ہم ایسے ہی ایک مقام کے بیان کے ساتھ اس دلیل فطرت کا بیان مکمل کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جنت انسان کا خواب ہے اور سزا و جزا اس کی فطرت کی پکار ہے۔ قرآن اسی پکار کا الہامی اور آخری جواب ہے۔

''یاد رکھو، جب کہ واقع ہو پڑے گی واقع ہونے والی۔ اس کے واقعہ ہونے میں کسی جھوٹ کا شائبہ نہیں۔ وہ پست کرنے والی اور بلند کرنے والی ہوگی۔ جب کہ زمین بالکل جھنجھوڑ دی جائے گی اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہو کر منتشر غبار بن جائیں گے۔ اور تم تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔ ایک گروہ داہنے والوں کا ہوگا، تو کیا کہنے ہیں داہنے والوں کے! دوسرا گروہ بائیں والوں کا ہوگا، تو کیا حال ہوگا بائیں والوں کا! رہے سابقون، تو وہ تو سبقت کرنے والے ہی ہیں! وہی لوگ مقرب ہوں گے۔ نعمت کے باغوں میں۔ ان میں بڑی تعداد اگلوں کی ہوگی اور تھوڑے پچھلوں میں سے ہوں گے۔ جڑاؤ تختوں پر، ٹیک لگائے، آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ان کی خدمت میں غلمان، جو ہمیشہ غلمان ہی رہیں گے، پیالے جگ اور شرابِ خالص کے جام لیے ہوئے گردش کر رہے ہوں گے جس سے نہ تو ان کو دردِ سر لاحق ہوگا اور نہ وہ فتورِ عقل میں مبتلا

ہوں گے اور میوے ان کی پسند کے اور پرندوں کے گوشت ان کی رغبت کے۔ اور ان کے لیے غزال چشم حوریں ہوں گی، محفوظ کیے ہوئے موتیوں کے مانند۔ صلہ ان کے اعمال کا جو وہ کرتے رہے۔ اس میں وہ کوئی لغو اور گناہ کی بات نہیں سنیں گے۔ صرف مبارک سلامت کے چرچے ہوں گے۔

اور رہے داہنے والے تو کیا کہنے ہیں داہنے والوں کے! بے خار بیریوں، تہہ بہ تہہ کیلوں اور پھیلے ہوئے سایوں میں۔ اور پانی بہایا ہوا۔ میوے فراواں، نہ کبھی منقطع ہونے والے نہ کبھی ممنوع۔ اور اونچے بستر ہوں گے اور ان کی بیویاں ہو گی جن کو ہم نے ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہو گا، پس ہم ان کو رکھیں گے کنواریاں، دلرُبا اور ہم سنیں۔ یہ نعمتیں داہنے والوں کے لیے ہوں گی۔ ان میں اگلوں میں سے بھی ایک بڑا گروہ ہوگا اور پچھلوں میں سے بھی ایک بڑا گروہ۔

اور بائیں والے تو کیا ہی برا حال ہوگا بائیں والوں کا! وہ لُو کی لپیٹ، کھولتے پانی اور دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے جس میں نہ کوئی ٹھنڈک ہوگی اور نہ کسی طرح کی کوئی افادیت۔ یہ لوگ اس سے پہلے خوش حالوں میں سے تھے اور سب سے بڑے گناہ پر اصرار کرتے رہے۔ اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ازسرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے! اور کیا ہمارے اگلے آباء واجداد بھی! کہہ دو! اگلے اور پچھلے سب جمع کیے جائیں گے۔ ایک معین دن کی مقررہ مدت تک۔ پھر تم لوگ، اے گمراہو اور جھٹلانے والو، زقّوم کے درخت میں سے کھاؤ گے اور اسی سے اپنے پیٹ بھرو گے، پھر اس پر کھولتا پانی تونسے ہوئے اونٹوں کی طرح پیو گے۔ یہ جزا کے دن ان کی پہلی ضیافت ہو گی! (واقعہ 56: 56-1)

[جاری ہے]

مکاتیب

21-05-14

ابو یحییٰ

عزیز بہن محترمہ وردہ ہارون صاحبہ

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

آپ کے سوالات کے جواب درج ذیل ہیں لیکن ایک اصولی بات یاد رکھیں۔ دین کا اصل مقصد تزکیہ نفس ہے یعنی خود کو پاک رکھنا۔ اسی پاکیزگی کو جو چیزیں آلودہ کرتی ہیں ان میں سے نمایاں ترین پر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے خود گفتگو کر کے بتایا ہے۔ فحش، منکر، ظلم وتعدی، شرک و بدعت یہ سب نفس کو آلودہ کرنے والی چیزیں ہیں۔

دور جدید میں ٹی وی فواحش پھیلانے کا ایک بڑا ذریعہ بن چکا ہے لیکن یہ دور جدید کے تمدن کا ایک ایسا لازمی حصہ بھی ہے جس سے بچنا آسان نہیں۔ اس لیے ٹی وی دیکھتے ہوئے اس اصول کی روشنی میں اپنا احتساب کرتے رہنا چاہیے۔ اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کے جواب درج ذیل ہیں۔

لغو بے مقصد اور بے کار باتوں کو کہا جاتا ہے۔ لغو قسم وہ قسم ہوتی ہے جو لوگ بلا قصد وارادہ بلاوجہ کھاتے رہتے ہیں۔ یہ بے کار باتیں اکثر بے ہودگی، شور وغوغا کی سطح کو جا پہنچتی ہیں جس میں گفتگو مسلمہ اخلاقی معیارات سے گر کر کی جاتی ہے۔ جملہ بازی، ہوٹنگ، طنز، تضحیک اور تمسخر کے جملہ سامان اس گفتگو کا لازمہ ہوتے ہیں۔ جس وقت قرآن مجید نازل ہو رہا تھا تو کفار نے جہاں اسلام کی دعوت کو نقصان پہنچانے کے لیے اور حربے اختیار کیے تھے وہیں ایک حربہ مسلمانوں کو بے حوصلہ کرنے کے لیے یہ تھا کہ ان کے خلاف ایک بھرپور پروپیگنڈا مہم چلائی جائے۔ یہ مہم ان تمام عناصر پر مشتمل تھی جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ لغو کا لفظ قرآن مجید نے اسی پس منظر میں اس پروپیگنڈا مہم کے لیے استعمال کیا ہے اور اس کا جواب دینے کے بجائے اس سے اعراض کرنے اور سلام کر کے گزر جانے کا حکم دیا ہے۔ اسی لغو کے نہ ہونے کو وہ جنت کی ایک بڑی نعمت گنواتا ہے۔

قرآن مجید کے ایک مقام پر لغو سے مراد بے مقصد چیزوں کو چھوڑنا بھی لیا جاتا ہے تاہم لغو کو جس معنی میں قرآن مجید میں زیادہ زیر بحث لایا گیا ہے وہ مذکورہ بالا پس منظر میں ہے۔قرآن مجید نے ترک لغویات کا حکم نہیں دیا بلکہ اعراض کا حکم دیا ہے۔ترک اپنے کسی کام کو کیا جاتا ہے جبکہ اعراض کرنا اس وقت موزوں ہوتا ہے جب کسی خارجی عمل سے بچنا پیش نظر ہے۔

لھو ولعب سے مراد کھیل تماشہ ہے۔اس کو دور جدید کی اصطلاح میں انٹرٹینمنٹ کہتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس کو دنیا کی زندگی کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔مگر اس کی مذمت اگر کی ہے تو اس پہلو سے جب یہ انسان کو عبادت سے ہٹا دے اور گمراہ لوگ اس کو دین کی دعوت سے دور کرنے کے لیے استعمال کریں۔ یہ کام اگر بیوی بچے بھی کریں تو وہ بھی قابل مذمت قرار پائیں گے۔ اپنی ذات میں یہ مباح چیزیں ہیں۔البتہ ٹی وی کا مسئلہ یہ ہے کہ اس میں معلومات اور تفریحات کے ساتھ فواحش، منکر اور لغو اکثر مل جاتے ہیں۔ان سے بچنا چاہیے۔کوئی چیز تفریح اس وقت تک رہتی ہے جب وہ ایک دائرے میں ہو۔اس سے باہر جب وہ عادت اور مقصد بن جائے تو پھر خود بڑی ناپسندیدہ چیز بن جاتی ہے۔اس پر متنبہ رہنا چاہیے۔

نگاہ کی حفاظت کے حوالے سے جس روایت کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہ ضعیف ہے۔اس معاملے میں اصل اصول قرآن مجید میں زیر بحث آ گیا ہے کہ مرد ہو یا عورت دونوں پر لازمی ہے کہ اپنی نگاہوں کو آوارہ نہ چھوڑیں۔ وہ صنف مخالف کو اگر دیکھیں تو بطور انسان دیکھیں۔ نگاہ کو کبھی آوارہ نہ ہونے دیں کہ جنسی لذت کی طلب میں خدوخال کا جائزہ لیتی پھرے بلکہ ایسا کوئی موقع پیش آجائے تو نگاہ جھکا لیا کریں۔ یہ بات کہ کوئی خاتون علی الاطلاق کبھی کسی مرد کو نہ دیکھے، دین کا مطالبہ نہیں۔

خواتین کے لیے اپنی محرم رشتہ داروں میں زینت دکھانے پر پابندی نہیں۔

والسلام

ابو یحییٰ

فرح رضوان

ڈائری کے چند اوراق

حکمت کم از کم دو طرح کی ہوتی ہے جس کا نتیجہ سامنے آنے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ آیا وہ درست حکمت عملی تھی یا غلط۔

غلط حکمت عملی کو درست میں بدلنے کا واحد حل یہ ہے کہ، فوراً یوٹرن لے کر صراط مستقیم پر زندگانی کی گاڑی کو موڑ لیا جائے_ اسی طرح طالبعلم بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں، کچھ لوگ علم سے سیکھتے ہیں کچھ دوسروں کے تجربات سے اور کچھ، استاد، والدین یا حالات سے مار کھا کر۔

اور انتہائی شرمندگی کے ساتھ اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑ رہا ہے کہ راقم کا شمار کسی حد تک آخر الذکر میں ہی ہوتا ہے۔

ہوا یوں کہ گھر کے بیک یارڈ میں اچھلتی کودتی ایک عدد گلہری پر دل آ گیا، وہ بھی ہماری نظروں کو بھانپ گئی آنکھیں چار ہونے کی دیر تھی کہ اس نے طرح طرح کی ادائیں دکھا کر دل موہ لیا۔ دن بھر کچن اور بیک یارڈ کے بیچ شیشے کے دروازے سے اس کی کارگزاریاں دکھائی دیتیں، کبھی وہ ہاتھ باندھنے کے انداز میں فریادی بنی کھڑی ہوتی، جیسے کہہ رہی ہو کہ باجی دو دن سے کچھ نہیں کھایا کچھ کھانے کو دے دو۔ اور ہزار بار یہ خیال آنے کے باوجود بھی، کہ کینیڈا میں اس طرح سے جانوروں کو فیڈ کرنا جرم ہے، کسی پڑوسی نے دیکھ کر شکایت کر دی تو بھاری فائن الگ دینا پڑے گا اور خفت و ندامت الگ اٹھانی پڑے گی، لیکن دل کسی پر آ جائے تو، عقل کی سنتا کب ہے؟ سو اب یوں ہونے لگا کہ دن میں دو بار، وہ آتی اور دروازے پر ٹک کر بیٹھ جاتی اور میں، دل سے مجبور اس بے کس و مجبور کو کچھ نہ کچھ ضرور ڈال دیتی۔ کچھ دن گزرے تھے کہ اس کا سٹیٹس سنگل نہ رہا، چلو جی کوئی گل نہیں بلکہ اچھا ہے کہ جو کھانا بچ جاتا ہے وہ کچرے میں نہیں جاتا بلکہ کسی بھوکے کے پیٹ میں جاتا ہے جو عین صدقہ ہے۔

ایک بار میری اس لوجک پر ایک دوست نے ٹوکا بھی کہ یہ جو گرین بن ہیں یہ اسی لیے ہیں لیکن مسئلہ سیدھا تھا کہ دل آ جائے کسی پر تو عقل کی آنکھ اور کان پر پتھر پڑ جاتے ہیں، کچھ دن گزرے کہ ہمیں اپنی چھت پر آوازیں آنی شروع ہو گئیں، شروع میں تو یہ کم تھیں لیکن بعد میں اتنی بڑھیں کہ اگر کوئی ضعیف العتقاد شخص ہوتا تو لازمی یہی سمجھتا کہ اوپر کسی اوپری چیز نے ڈیرہ ڈال لیا ہے۔ بہرحال چھت سے جانوروں کو پکڑنے والوں سے رابطہ کیا گیا، اور زیادہ افسوس ان سے یہ جان کر ہوا کہ یہ ہماری

پیاری راج دلاری گلہریاں تھیں جنہوں نے طعام کے اتنے عمدہ اہتمام کے بعد ہمارے ہی سر پر قیام کا خود ہی انتظام فرما لیا تھا۔

اس روز جس طرح مجھے اس بات کی گہرائی سمجھ آئی تھی کہ ایک مسلمان کو کس کس طرح کس حد تک مسلم یا غیر مسلم حکمران کے احکامات کی پابندی کرنی چاہیے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ بہر حال ایک خطیر رقم دے کر یہ سبق حاصل کر لیا اور اوپر جالیاں کیج سب لگوا کر مطمئن ہو گئے، لیکن دو دن نہ گزرے تھے کہ پھر کھٹ پٹ شروع اور پھر دھما چوکڑی اور گھمسان کا رن، لیکن ابھی شکر تھا کہ ہفتے بھر کی وارنٹی میں کام ہوا تھا اور ہفتہ مکمل نہ ہوا تھا۔ مگر دوسری طرف یہ پتہ چلا کہ جناب جو در، ہم ایک بار بند کر دیتے ہیں وہ دوبارہ کھلے تب تو وارنٹی کی رقم میں کام ہو جاتا ہے لیکن جانور نیا رستہ بنا لے تو فیس بھی نئی۔ اس پر اس ڈپارٹمنٹ کو تو ہم نے نہیں کہا اور پھر اپنے کونٹریکٹر سے جو غالبا اسپینش، اور ہر فن مولیٰ ہے کال کیا، لیکن ہفتہ نہ گزرا تھا کہ پھر شور۔ اس شور میں بہت زیادہ زیادتی کی وجہ یہ تھی کہ ان دو گلہریوں کی گود ہری اور ہماری مصیبت دوہری ہو چکی تھی۔ ہمارے گھر کے سامنے، دائیں بائیں، ماشاءاللہ بہت ہی اچھے پڑوسی ہیں ہر کام میں بہت ہی مددگار، تو ایک روز انہیں میں سے ایک نے پوچھا کہ آپ لوگوں کو کچھ فنی آوازیں تو نہیں آتیں؟ کیونکہ ہر روز میں آپ کی چھت پر پانچ گلہریوں کو اچھلتے دیکھتا ہوں، ہمارے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا کہ قسم لے لو یہ فنی نہیں اذیت ناک آوازیں ہیں کیونکہ سب بچے تھک ہار کر جب سوتے تو ان کا شور سونے نہیں دیتا۔ اور جب سے ایک دوست نے بتایا تھا کہ ایسے ہی ایک کیس میں اس کی نند کی چھت کتر کتر کر گرا دی تھی گلہریوں نے تب سے جان حلق میں اٹک گئی تھی، ہم نے ان کو فیڈ کرنا تو کب سے بند کر دیا تھا، جس کے جواب میں انہوں نے ہمارے سیب کے درخت سے تمام پھل غائب کر ڈالے۔ تین چار بار، جگہ جگہ سے راستے بند کیے تھے حتیٰ کہ نہ قابل یقین حرکت یہ بھی کی انہوں نے کہ برساتی پانی کی نکاسی کے لوہے کے پائپ کے پیچ تک الگ کر کے رستہ بنا لیا۔

پھر کنٹریکٹر کو فون، پھر بے چارہ وہ ہنگامی بنیادوں پر حاضر، لیکن اب کی بار یہ ہوا کہ ان کے بہت ہی چھوٹے بچے شدید سردی میں ٹھٹھرتے کانپتے شیشے کے اسی دروازے پر آ کر بیٹھ گئے اور ہماری فیملی نے

مشترکہ طور پر ان کی فیملی کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ اگر اب کے انھوں نے واپسی کا رستہ بنا لیا تو برف ختم ہونے تک ہم اپنا آرام وسکون قربان کر کے ان کو نکالنے کی کاروائی ترک کر دیں گے۔ اور یہی ہوا کہ اگلے ہی دن پھر پھٹا پھٹ دھنا دھن تڑا تڑ گھس پھس، دھبڑ دھبڑ کی ساری آوازیں آنی شروع ہوگئیں اور اب کی بار یہ سوچ کر کہ کہیں بھوک میں یہ چھت کو کتر کتر کر ہی نہ ڈھا دیں ہم نے ان کو دوبارہ فیڈ کرنا شروع کر دیا، اور یہ بھی صحیح کی بھتہ خور نکلیں، جب جتنا مانگتیں ہم دیتے رہے کہ بس چھت محفوظ رہے اور ہر روز کی برف باری اور طوفان تھمنے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر ایک کیج آ گیا کہ ایک ایک کر کے ان کو پکڑ کر ایک ہی جنگل میں چھوڑ آئیں گے، تا کہ فیملی ری یونین ہو جائے، پر یہ بھی بڑی سیانی نکلیں بہر حال بچہ جو، اب کافی بڑا ہو چکا تھا وہ عقل کا کچا نکلا اور پکڑا گیا۔ لیکن وہ بھی عقل کا ہی کچا تھا نصیب کا نہیں کہ بیٹی صاحبہ کے سامنے پکڑا گیا اور پھر جو وہ گھبرایا ہے اس میں تو بیٹی نے تڑپ کر اسے آزاد کروا دیا کہ آپ لوگ کوئی اور حل تلاش کریں یہ ظلم نہ کریں اور میں اس کی اس خواہش کے سامنے چپ رہی، جو اتنے عرصے سے صرف ان کا ہی شور برداشت نہیں کر رہی تھی اپنے ضمیر کی مسلسل ملامتوں کو بھی سن رہی تھی، کہ میں وہی تو ہوں جو ان لوگوں سے ہمیشہ شاکی رہتی ہوں جو گھروں میں شوقیہ جانور پالتے اور ان پر ہزاروں ڈالرز خرچ کر ڈالتے ہیں جبکہ اتنی خطیر رقم سے تو کسی بھی مستحق کے دسیوں کام میں امداد اور ان کے خاندان کی زندگی آسان کرنے میں مدد کی جا سکتی ہے۔ اور اب میرا ہی خود ساختہ صدقہ جاریہ، پورے گھر کے لیے مسلسل خوار یہ بن چکا تھا، کئی بار کی مرمت میں خطیر رقم خرچ ہو چکی تھی۔

بہر حال پھر ہوا یوں کہ اس بار کنٹریکٹر نے بہت ہی بہترین انتظام کے ساتھ فول پروف مرمت کی اور پھر ہم ہنسی خوشی رہنے لگے........ چار دن کے لیے، چوتھے دن اللہ نے ہم پر اتنا کرم کیا کہ جتنا شکر کریں کم ہے کہ اچھے پڑوسی نے بیل بجا کر بتایا کہ بھائی صاب آپ کی چھت پر جو وینٹ کا کور ہے اسے، اس جنگلی حیات نے کتر کتر کر زمین بوس کر ڈالا ہے، آج رات شدید بارش اور صبح طوفان کی پیش گوئی ہے، اگر کھلی چھت پر پانی پڑ گیا تو بے حد نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس نے محلے میں

بڑی سیڑھی کی تلاش شروع کردی کہ مل جل کر مدد ہو سکے، دوسرے پڑوسی کو پتہ چلا تو وہ کچھ امدادی سامان لے آیا لیکن پروفیشنل سیڑھی کسی کے پاس نہ تھی سو کنٹریکٹر کو کال کیا گیا اور اتوار کی شام ہونے کے باوجود وہ اور اس کی بیوی دونوں گھنٹے بھر کی ڈرائیو کر کے فوراً مدد کو پہنچے کہ کہیں بارش ہوگئی تو بہت نقصان ہو جائے گا۔اور جہاں یہ کرم تھا اللہ تعالیٰ کا کہ بروقت پڑوسی کی نگاہ پڑ گئی، امداد کو سب آ گئے وہاں یہ بات بھی غور طلب تھی کہ ان میں سے کوئی ایک بھی کسی بھی فرقے کا مسلمان نہ تھا_ بہرحال یہ بہت کاری وار تھا ہمارے un wanted guests کا سو بچوں نے بھی فتویٰ صادر کر دیا کہ مسلمان ایک سوراخ سے دوسری بار نہیں ڈسا جاتا تو اب آپ ان کو پنجرے میں پکڑ لیں۔

اگلے دن جب پنجرہ لگا، ایک نیا سبق ہم نے یہ سیکھا کہ ہر فیصلے کا ایک درست وقت ہوتا ہے جو نکل جائے تو اس پر عمل درآمد ناممکن ہو جاتا ہے۔وہ اس طرح کہ سرد موسم کے رخصت ہونے پر لمبی چونچ والی بڑی چڑیاں واپس آ چکی تھیں، تو ادھر کیج میں کچھ کھانے کو رکھ کر سیٹ کرتے ،اگلے چند منٹ میں چڑیا باہر سے ہی کھانے پر چونچ مارتی اور خالی کیج کا دروازہ بنا شکار کے ہی بند ہو جاتا ..... لیکن الحمدللہ ،کوشش ،دعا یا توبہ شاید قبول ہو چکی تھی ،اور اس بار مرمت کے بعد کوئی نازک راستہ بچا بھی نہ تھا ،اس لیے ان گھس بیٹھیوں کا ٹولہ ،تھک ہار کر نقل مکانی کر گیا.......

ڈائری کے یہ اوراق شیئر کرنے کی وجہ وہ نہیں جواب تک کی روداد سے آپ سمجھے ہیں، بلکہ اتفاق سے زندگی کی اس پریکٹکل کلاس کا اینڈ ہوتے ہوتے ، رجب آ گیا ....اور رجب اور شعبان میں ہمارے یہاں جس درجے کی بدعات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ان کی طرف ذہن چلا گیا اور اچانک سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہر بدعت اسی طرح ہی تو شروع ہوتی ہے،اپنی مرضی کی نیکی کے زعم میں، ذرا سی، بنا مشقت آسان سی نیکی کی خواہش میں،مزید ارسی نیکی کے لبادے میں، خیر خواہی اور حقوق ادا کرنے کی آڑ میں،تو کیا ہو گیا کے بہانے کے ساتھ۔ تو دیکھ لیا کہ کیا ہوا،صرف ایک rule کو over rule کرنے سے یہاں تو محض کئی ماہ کی کوفت، لکا چھپی کا کھیل اور خطیر رقم کا زیاں ہی

تھا لیکن بدعات تو ایمان کے نام پر ایمان کا صفایا کر دینے والا نا قابل تلافی نقصان ہے، آخرت کے شدید پچھتاوے کا نام ہے، اور وجہ صرف ایک ہی ہے، بالکل وہی ہٹ دھرمی ، جو کافر کرتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا غلط تھے کیا؟ بے شمار مذہبی پیشوا سرے سے غلط ہیں کیا؟ صرف آپ ہی ایک عقل مند، عالم اور صحیح دین پر ہیں، اور ان گنت لوگ احمق یا جاہل ہیں کیا؟

ایک دوست بتاتی ہیں کہ "جب پہلی بار ہم نے بدعات کے بارے میں جانا تب تک ہمارے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد بے حد پڑھے لکھے چلتے پھرتے انسائکلو پیڈیا، انگلش اردو کی لغت تھے۔ کبھی ہمیں کتاب کھولنے کی ضرورت ہی نہ پڑی، جو لفظ ہوتا جو مسلہ ہوتا ہم والد سے پوچھ لیتے اور بلا تردد ہمیں ہر جواب مل جاتا۔ دور اور قریب کے تمام احباب، محلے دار، سبھی ان کی شخصیت سے ایسے ہی فائدہ حاصل کرتے، اور ان کے علم سے مرعوب ہوتے۔ ان پر رشک اور مکمل اعتماد کرتے، اور کبھی کوئی کتاب کھول کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھتا۔ لیکن جب ان کے بعد ہمیں اپنے سوالات و مسائل کے حل کے لیے کتابیں کھولنی پڑیں، لیکچرز سننے پڑے تب......... تب ذہن یہ قبول کرنے کو تیار ہی نہ تھا کہ میرے والد سے اتنی بڑی چوک کیسے ہو گئی، کہ قرآن اور صحیح احادیث سے ہٹ کر خود ساختہ روایات کی تقلید نہ صرف وہ کرتے رہے..... کیونکہ ان کے بزرگ کیا کرتے تھے، بلکہ ساتھ ہی وہ اپنی اولاد اور ہم اپنی اولاد میں منتقل کرتے گئے۔ کیونکہ یہ من گھڑت روایات، نہ صرف خاندانی طور پر پشت در پشت چلی آ رہی ہیں بلکہ ان کا ایک راستہ بند کرو تو دوسرے کئی راستوں سے آن موجود ہوتی ہیں۔ "مذہبی پیشواؤں" کے ذریعے سے مساجد سے، اخبارات سے میگزینز سے کتابوں سے اور اب تو ہر چیز کو رکھو ایک طرف tv کے مشہور و معروف سکالرز سے، پوری پوری ٹرانسمیشن سے، جائیں تو جائیں کہاں؟ اور واقعی جب کوئی نظر نہیں آتا تب ایک اللہ ہی نظر آتا ہے۔ مجھے اپنے والد کے لیے سب سے زیادہ دکھ تھا سب سے بڑا پہاڑ یہی تھا کہ وہ ہیرو جو ہمیشہ سے بہت اونچی مسند پر تھے جن کے علم کا لوہا ایک دنیا مانتی تھی، ایک پل میں ان کا علم، وقار، قد و قامت سب کچھ کیسے زیر و ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر ہر جذبے اور

تعصب سے ہٹ کر دل سے دعا کی اور صرف قرآن اور صرف صحیح حدیث کی روشنی میں جاننے کی کوشش کی، حقیقت کو تسلیم کیا اور الحمدللہ، اللہ نے رہنمائی فرمائی، بات طویل ہو رہی ہے، لیکن!!!!!!!!!!

سوال یہ ہے کہ کیا کسی بھی کمپنی میں جاب کے لیے یا کسی ملک کی شہریت پانے کے لیے جو ٹیسٹ دیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک بھی mandatory سوال کا جواب درست نہ دیا جائے یا سرے سے دیا ہی نہ جائے تو آپ کو کیا ملے گا؟ وہ انڈا جو نہ اگلے بنے نہ نگلے۔ اور رونا اس بات کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عافیت پانے کی جو چار بنیادی شرائط رکھی ہیں یعنی کامل ایمان، عمل صالح، حق کی تلقین صبر کی تاکید اس میں سے ہم شیر کا جگر رکھنے والے خم ٹھونک کر تین کام تو بہت خوش اسلوبی سے کرتے ہیں لیکن چوتھا یعنی حق کی تلقین کو خاموش رہنے میں ہی حکمت کے خانے میں ڈال کر مطمئن ہو رہتے ہیں۔ آج ہم اپنی اس غلط حکمت عملی یا دین پر بے عملی کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ غیر مسلموں کے گھر تک جا کر انھیں دین کی دعوت نہ دی۔ اور وہ ہمارے گھروں میں، گولہ بارود اور اپنے کلچر سمیت گھس گئے، خاندانوں میں رائج غلط اصولوں پر، محبت، رعایت، کم علمی، معاملہ فہمی، احسان، کے نام پر اپنے جائز stance کو صدقہ کر ڈالا، بدعت کرنے والے اپنے پیارے بزرگوں، عزیزوں، پڑوسیوں کو نہ روک سکے نہ ٹوک سکے نہ حق کی تلقین کر پائے اور نتیجہ؟... کسی سے چھپا ہوا تو نہیں۔

یاد رکھیے کہ جو لوگ بندر بنا دیے گئے تھے ان کی قوم میں بھی ہمارے ہی جیسے تین طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو برملا برائی کرتے تھے۔ دوسرے وہ جو برائی دیکھ کر، سانو کی والا رویہ رکھتے۔ تیسرے وہ تھے جو بلا خوف حق کی نصیحت کرتے اور برائی سے روکتے تھے، اور وہی بچا لیے گئے تھے۔ لوط علیہ السلام کی بیوی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ یہی کہ وہ اتنی لبرل تھی کہ اس نے برائی کو دل میں برا جاننا بھی اہم نہ سمجھا اور بروں کے ساتھ عذاب میں ماری گئی. اور اب ہمارا حال یہ ہے کہ پانی گردن تک آ چکا ہے اور ہم حکمت، مروت، اور مفاد کے ماروں کے حلق سے بچاؤ بچاؤ کی آواز تک نہیں نکل پا رہی۔

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (13)

اللہ تعالیٰ نے انسان کا لائف سائیکل اس سے بہت مختلف بنایا ہے۔ انسان ایک کمزور بچے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے جسے اگر توجہ نہ ملے تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہیں سے اسے ایک ماں اور ایک باپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے ایک ایسی ہستی درکار ہوتی ہے جو خوراک سے لے کر پیشاب کروانے تک اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کی ایک آواز پر وہ دل کی گہرائیوں سے لبیک کہتی ہوئی آئے اور اسے اپنی گود میں لے کر اپنی مامتا کے جذبات نچھاور کرے۔

اہل مغرب نے ماں کے متبادل کے طور پر ڈے کیئر سنٹر بنا لیے۔ ان کی اپنے ماہرین سماجیات کی تحقیقات گواہ ہے کہ کرائے کی مائیں بچے کو وہ محبت نہیں دے سکتیں جو اس کی نفسیاتی نشو ونما کے لئے ضروری ہے۔ بچے کو حقیقی ماں کی محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ صرف ماں بلکہ بچے کو ایک باپ کی ضرورت بھی ہوا کرتی ہے۔ ایسا باپ جو بچے کو اپنی پدرانہ شفقت عطا کرے۔ اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے معاشی دوڑ دھوپ کرے۔ اگر ماں اور باپ دونوں کی ذمہ داری کسی ایک فرد کو سونپ دی جائے تو بچے کی مکمل ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔

مغربی تہذیب کو اپنانے والے ممالک میں سنگل پیرنٹ بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایک سروے کے مطابق آسٹریلیا میں 20 فیصد بچے صرف والدہ یا والد کے زیر نگرانی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آسٹریلوی ماہر ڈیوڈ رو کہتے ہیں:

ایسے بچے جو کہ والدین میں سے کسی ایک کے زیر سایہ پروان چڑھ رہے ہوں میں دماغی بیماریوں، خودکشی کرنے یا الکوحل سے متعلق بیماریوں کا شکار ہو جانے کا تناسب ان بچوں کی

نسبت دوگنا ہے جن کی تربیت ماں اور باپ دونوں نے مل کر کی ہو۔ سنگل پیرنٹ لڑکیوں میں منشیات کے استعمال کا تناسب تین گنا اور لڑکوں میں یہ تناسب چار گنا ہے۔ سویڈن کے نیشنل بورڈ فار ہیلتھ اینڈ ویلفیئر کی مصنف گونیلا رنگ بیک کے مطابق ان بچوں کی بڑی تعداد غربت کے باعث صحت کے مسائل کا شکار رہتی ہے۔

http://www.theage.com.au/articles/2003/01/24/1042911549349.html

امریکی ماہر میک لاناہن کے مطابق ان بچوں کو پوری توجہ نہیں ملتی اور ان کے مالی وسائل بھی کم ہوتے ہیں جس کی وجہ سے یہ طرح طرح کی جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ مسئلہ صرف بچے ہی کا نہیں ہے۔ انسان جوانی کا طویل عرصہ گزار کر اس دور میں بھی جا پہنچتا ہے جسے قرآن میں ''ارزل عمر'' کہا گیا ہے۔ جوانی ڈھلنے کے ساتھ ساتھ انسان کو طرح طرح کی بیماریاں گھیر لیتی ہیں۔ بچہ تو دن بدن بہتری کی طرف گامزن ہوتا ہے لیکن ایک بوڑھے شخص کی حالت ہر روز بگڑتی چلی جاتی ہے۔ اس وقت بھی اس شخص کو کسی بچے کی طرح توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اہل مغرب نے اولڈ ہوم بنا کر اس مسئلے کو بھی حل کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس سے مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ان اولڈ ہومز میں بوڑھوں کو میڈیکل کی سہولیات، کھیل اور ساتھی تو مل جاتے ہیں مگر ان کی حسرت بھری نگاہیں اپنی اولاد کو تکتی رہتی ہیں جن کے پاس اپنے بوڑھے والدین کے پاس آنے کا وقت نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس اہل مشرق خوش نصیب ہیں کہ انہیں بچپن میں ماں اور باپ دونوں کا پیار ملتا ہے۔ جوانی میں یہ اپنی محبت اپنے والدین اور بچوں پر لٹاتے ہیں۔ جب ان کا بڑھاپا انہیں آ گھیرتا ہے تو پھر یہی اولاد ان کی ہر جسمانی اور نفسیاتی ضرورت کو پورا کرنے کا باعث بنتی ہے۔

اہل مشرق کو یہ فائدہ صرف اور صرف خاندانی نظام کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالی نے اس نظام کو انسان کی بنیادی ضرورت کے طور پر قائم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام آسمانی کتابوں میں بدکاری کو گناہ سے بھی بڑھ کر جرم قرار دیا گیا ہے۔

اگر کسی معاشرے میں بدکاری پھیل جائے تو پھر اس کا براہ راست اثر خاندان پر پڑتا ہے۔ کوئی خاتون یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کا خاوند کسی باہر کی عورت سے تعلقات قائم کرے۔ اسی طرح کوئی مرد بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی بیوی کا کوئی آشنا بھی ہو۔ ایسا ہونے کی صورت میں خاندان ٹوٹ جاتا ہے جس کا فوری نقصان بچوں کو پہنچتا ہے۔ چند سال بعد جب یہ مرد و خواتین بوڑھے ہوتے ہیں تو خاندان کے ٹوٹنے کا یہی نقصان ڈپریشن کی صورت میں لوٹ کر انہی کی طرف آتا ہے اور وہ حسرت زدہ نگاہوں سے اپنی اولاد کو تلاش کرتے رہ جاتے ہیں۔

اللہ تعالی اپنی مخلوق سے محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے آسمانی شریعت انسان پر پابندیاں لگانے کے لئے نہیں بلکہ اس کے لاینحل مسائل کو حل کرنے کے لئے دی ہے۔ انسان جب آسمانی شریعت سے منہ موڑ لیتا ہے تو وہ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ کہیں مغربی ممالک جیسی بے راہ روی جنم لیتی ہے اور کہیں ہمارے پس ماندہ علاقوں کی طرح عورت کو غلام بنالیا جاتا ہے۔

اگر قرآن مجید کا جائزہ لیں تو اس معاملے میں اس کی ہدایت بہت ہی واضح ہے۔ قرآن مجید مرد و خواتین کو کسی کام سے نہیں روکتا بلکہ باہمی ملنے جلنے کے وقت انہیں اپنے لباس اور رویے میں ایک شریف اور باحیا انسان کا کردار ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

ہمارے ہاں حیا اور حجاب کو صرف خواتین کے ساتھ مخصوص کرلیا گیا ہے۔ مگر قرآن مجید کی نظر میں حیا صرف خواتین کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مردوں کے لئے باحیا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ خواتین کے لئے۔ قرآن مجید دونوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی

نظر کو باحیا بنا کر رکھیں۔ حیا کا مطلب جھجک نہیں ہے۔ حیا ایک رویے کا نام ہے کہ انسان خود کو ایک شریف اور ذمہ دار شخص سمجھے۔ دوسروں کی بہو بیٹیوں اور شوہروں پر ڈورے ڈالنے کی بجائے اس کی نظر ایک شریف انسان کی سی ہو۔ سیکس سمبل بننے کی بجائے وہ اپنے لباس، رکھ رکھاؤ اور کردار میں پاکیزہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، "اگر تم میں حیا نہ رہے تو پھر جو جی چاہے کرو۔"

اب فیصلہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری اگلی نسلیں سنگل پیرنٹ بنیں اور ہم اپنے بڑھاپے کی حسرتوں میں تنہا ہوں تو بصد شوق مغربی تہذیب کو اختیار کیجیے۔ اگر ہمیں یہ پسند نہیں ہے تو ہمیں خاندان کے ادارے کو بچانا ہوگا۔ اس کے لئے معاشرے میں بے حیائی اور بدکاری کو پھیلنے سے روکنا ہوگا۔ اسی طرح ہم اپنی آنے والی نسلوں کے بچپن اور بڑھاپے کو خوشگوار بنا سکیں گے۔

یہ عجیب بات تھی کہ ہمیں یہ ماحول مغربی لگ رہا تھا مگر ایک مغربی مصنف کو یہ ماحول مشرقی نظر آتا ہے۔ امریکی سفر نامہ نگار مارک لیپر لکھتے ہیں:

"یہاں کی خواتین کی ایک تہائی تعداد گرم موسم میں بھی اپنے سر کو ڈھانپ کر رکھتی ہے۔ صرف ایک خاوند ہی اپنی بیوی کے بال دیکھ سکتا ہے۔ وہ اس معاملے میں وہی نقطہ نظر رکھتے ہیں جو ہمارا (عورت کے) سینے سے متعلق ہے۔"

ترکی کے خواتین و حضرات کی بڑی تعداد اگرچہ مغربی تہذیب کو اپنا چکی ہے مگر یہ ابھی تک پوری طرح مغربی نہیں ہو سکیں۔ اہل مشرق انہیں مغربی سمجھتے ہیں مگر اہل مغرب انہیں ابھی تک مشرقی ہی قرار دیتے ہیں۔ ترکی کے نوجوانوں کو ہم نے بڑی حد تک باحیا ہی پایا۔ کہیں یہ نہیں دیکھا کہ لڑکے لڑکیوں کو تنگ کر رہے ہوں، سیٹیاں مار رہے ہوں یا ان کے پیچھے پیچھے جا رہے ہوں۔

[جاری ہے]

غزل

(پروین سلطانہ حنؔا)

تھام کر دامنِ مصطفیٰ اے خدا، میں نے تیری ڈگر پر قدم رکھ دیا
آسماں کی طرف میری نظریں اٹھیں، سامنے اس نے لوح و قلم رکھ دیا

لوگ سارے یہاں پر ہی مصروف ہیں، اپنے اپنے مفادات کی جنگ میں
بالمقابل زمانہ ہے اور سامنے آپ کا میں نے نقشِ قدم رکھ دیا

اتنی لمبی مسافت سے تھک ہار کے ، لوٹ آئے تو ہو ، ساتھ کیا لائے ہو
میں نے کچھ نہ کہا، ان کی سرکار میں، اپنا سرمایۂ چشمِ نم رکھ دیا

لوگ پتھر اٹھا کر بھی سرشار ہیں، سنگ بردار ہیں اور تیار ہیں
روح گھائل ہوئی، پاؤں زخمی ہوئے، ہر قدم پر زمانے نے غم رکھ دیا

مشکلیں راہ میں یوں تو آتی رہیں، زخم کھا کر بھی میں مسکراتی رہی
اپنے امکاں تلک حق نبھاتی رہی، راہ میں، میں نے حق کا علَم رکھ دیا

آدمی کے تعاقب میں شیطان ہے، وہ تو آزاد رو ہے کہ انسان ہے
کہ برا اور بھلا دیکھ کر وہ چل راستے میں اگر پیچ و خم رکھ دیا

زندگی سوز ہے، ساز ہے، راگ ہے، یہ ازل سے ابد تک کا اک راز ہے
ہر نفس سن رہا ہے بڑے غور سے، وقت نے نغمۂ زیرو بم رکھ دیا

حق نے اعزاز بخشا ہے مجھ کو حنؔا، زیرِ سایہ رہوں ، اس گھنی چھاؤں میں
اس کی خدمت کروں، مجھ کو جنت ملے، یہ صلہ ماں کے زیرِ قدم رکھ دیا

اپنی شخصیت اور کردار کی تعمیر کیسے کی جائے؟

محمد مبشر نذیر

جب ہیرے کو کان سے نکالا جاتا ہے تو یہ محض پتھر کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ایک ماہر جوہری اسے تراش خراش کر انتہائی قیمتی ہیرے کی شکل دیتا ہے۔انسان کی شخصیت کو بھی تراش خراش کر ایک اعلیٰ درجے کی شخصیت بنانا بھی اسی قسم کا فن ہے۔اگر آپ بھی یہ فن سیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کیجیے۔

قیمت: 150 روپے (ڈسکاؤنٹ کے بعد)

دین کے بنیادی تقاضے

پروفیسر محمد عقیل

☆ دین کے احکامات پر مبنی ایک کتاب
☆ تزکیہ نفس کرنے والوں کے لئے مشعل راہ
☆ دین کے اوامر و نواہی کی سائنٹفک پریزنٹیشن
☆ ہر حکم کی مختصر تشریح
☆ ہر امر کا قرآن و حدیث سے حوالہ

قیمت: 150 روپے (ڈسکاؤنٹ کے بعد)

حج کا سفر (ابلیس سے جنگ کی روداد)

پروفیسر محمد عقیل

حج کے بے شمار سفرنامے لکھے گئے ہونگے۔اس سفرنامے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حج کے مناسک کو اصل روح کے ساتھ تمثیلی پیرائے میں بیان کرتا ہے۔یہ کتاب دونوں اقسام کے لئے لوگوں کے لئے مفید ہے جنہوں نے حج کر لیا ہو یا حج کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

قیمت: 120 روپے (ڈسکاؤنٹ کے بعد)

گھر بیٹھے کتب حاصل کرنے کے لئے اس نمبر پر ابھی رابطہ کیجیے: 03323051201

جنت میں ملائکہ کے سلام کے مستحق لوگ

''اوران مومنوں کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے پیمان کو نہیں توڑتے ،

اوراللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں ،

اوراپنے رب سے ڈرتے ہیں اوراس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے ،

اوران کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں ،

اور نماز قائم کرتے ہیں ،

اور ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں ،

اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں ،

آخرت کا گھر اِنہی لوگوں کے لیے ہے، یعنی ایسے باغ جوان کی ابدی قیام گاہ ہوں گے ۔ وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اوران کے آباؤ اجداد اوران کی بیویوں اوران کی اولاد میں سے جو جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے ۔ ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے اوران سے کہیں گے کہ 'تم پر سلامتی ہے، تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو'..... پس کیا ہی خوب ہے یہ آخرت کا گھر!'' (الرعد 13:24-20)